سہ ماہی
صالحات
خواتین کے لیے

مدیر: نعیم احمد بلوچ

جلد: 3 شمارہ: 4 اکتوبر تا دسمبر 2026ء

علم و آگہی اور شعور و تربیت

ایک مضبوط عورت وہ نہیں جو مرد سے نفرت کرنا سیکھ لے اور نہ وہ جو مرد کی نقل کر کے اپنی نسوانی شناخت سے دست بردار ہو جائے۔ مضبوط عورت وہ ہے جو اپنی شخصیت کو کسی دوسرے انسان کی ملکیت بننے سے بچا سکے اور کسی بازار کی شے بننے سے بھی۔

وہ تعلیم حاصل کرے، ہنر پیدا کرے، معاشی طور پر اس حد تک بااختیار ہو کہ محض روٹی، مکان یا تحفظ کی خاطر کسی ناگوار اور غیر مطلوب تعلق میں رہنے پر مجبور نہ ہو۔ وہ اپنی شادی کے فیصلے میں صاحبِ رائے ہو۔ وہ شریکِ حیات کا انتخاب کرے تو ضرورت اور بے بسی کے تحت نہیں بلکہ شعوری رفاقت کے طور پر کرے۔ اور اگر کسی مرحلے پر وہ تنہا ہو تو اس کی تنہائی اسے بے وقار، بے شناخت یا بے سہارا انسان میں تبدیل نہ کر دے۔ اصل آزادی شاید یہی ہے۔

(قصہ مختصر)

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

علم و آگہی اور شعور و تربیت

سہ ماہی صالحات

خواتین کے لیے

جلد: 3 شمارہ: 4 اکتوبر تا دسمبر 2026ء

مدیر: نعیم احمد بلوچ نائب مدیر: وجیہہ حسان واحدی

مجلس ادارت

ارم نبی، بینش سلیم، ثوبیہ نورین، غزل چودھری، نکہت ستار، عائشہ وحید

مجلس مشاورت

کوکب شہزاد، منیزہ ہاشمی، نسرین آفتاب، بشریٰ اعجاز، ڈاکٹر عظمیٰ عثمان

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

سہ ماہی
صالحات
علم و آگہی اور شعور و تربیت
مدیر: نعیم احمد بلوچ
نائب مدیر: وجیہہ حسان واحدی

فہرست مضامین

1۔ نکاح اور مہر کی حقیقت	استاد جاوید احمد غامدی	04
2۔ کیا شگون لینا توہم پرستی ہے؟	محمد حسن الیاس	07
3۔ عورت: ملکیت، شے یا انسان؟	مدیر کے قلم سے	10
4۔ ام عمارہ نسیبہ بنت کعب: اُحد سے یمامہ کے میدان تک	نعیم احمد بلوچ	14
5۔ ہماری اولاد کس کے نقشِ قدم پر؟	وجیہہ حسان واحدی	24
6۔ فنون لطیفہ: اسلام کی نظر میں	گفتگو: جاوید احمد غامدی/ اخذ و ترتیب: حافظ غلام دستگیر	30
7۔ تین دیویاں	نعیم احمد بلوچ	36
8۔ منزلوں کے بیچ، خود سے ملاقات	پروفیسر نسرین جاوید خان	46
9۔ ایک خاموش فریاد	عائشہ کلیم	52
10۔ سوشل میڈیا اور سکرین ایڈکشن کے فائدے، میری زندگی کے ضامن!	ثوبیہ نورین	58
11۔ غزلیات	جاوید احمد غامدی/ فرحان سید	66
12۔ محبت، تشدد اور ایک عورت کا فیصلہ It Ends with Us	مجلس صالحات	70

تعلیم القرآن



استاذ جاوید احمد غامدی

نکاح اور مہر کی حقیقت

وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿24النساء﴾

ترجمہ

اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی کے نکاح میں ہوں، الاّ یہ کہ وہ تمھاری ملکیت میں آجائیں۔ یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم کی گئی ہے۔ اور اِن کے ماسوا جو عورتیں ہیں، (اُن کا مہر ادا کر کے) اپنے مال کے ذریعے سے اُنھیں حاصل کرنا تمھارے لیے حلال ہے، اِس شرط کے ساتھ کہ تم پاک دامن رہنے والے ہو نہ کہ بدکاری کرنے والے۔ پھر (اِس سے پہلے اگر مہر ادا نہیں کیا ہے تو) جو فائدہ اُن سے اٹھایا ہے، اُس کے صلے میں اُن کا مہر اُنھیں ادا کرو، ایک فرض کے طور پر۔ مہر ٹھیرانے کے بعد، البتہ آپس کی رضامندی سے جو کچھ طے کر لو تو اُس میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بے شک، اللہ علیم و حکیم ہے۔

تفسیر

اس تعلیم کا پہلا مخاطب وہ معاشرہ تھا جہاں جنگوں میں عورتوں کو قیدی بنایا جاتا تھا۔ اس زمانے کا دستور یہی تھا کہ کسی کی ملکیت میں آتے ہی اُن عورتوں کا پہلا نکاح آپ سے آپ ختم سمجھا جاتا تھا۔ یہ اُس زمانے کا قانون تھا جسے قرآن نے بھی باقی رکھا۔ چنانچہ قیدی عورتیں اگر چاہتیں تو پکڑے جانے کے بعد کسی بھی شخص سے نکاح کر سکتی تھیں۔ اِس کے لیے اُنھیں اپنے پہلے شوہروں سے طلاق لینے کی ضرورت نہیں تھی۔

مہر کی حقیقت

اِس سے واضح ہے کہ نکاح مال، یعنی مہر کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہ نکاح کی ایک لازمی شرط ہے۔ چنانچہ آگے ہدایت فرمائی ہے کہ اِس سے پہلے اگر کسی عورت کا مہر ادا نہیں کیا گیا تو اُسے فوراً ادا کر دیا جائے۔ یہ مہر کیا ہے؟ مرد و عورت نکاح کے ذریعے سے مستقل رفاقت کا جو عہد باندھتے ہیں، اُس میں نان و نفقہ کی ذمہ داریاں ہمیشہ سے مرد اٹھاتا رہا ہے، یہ اُس کی علامت () ہے۔ قرآن میں اِس کے لیے 'صَدَقَۃ' اور 'اَجر' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یعنی وہ رقم جو عورت کی رفاقت کے صلے میں اُس کی ضرورتوں کے لیے دی جائے۔ نکاح اور خطبے کی طرح یہ بھی ایک قدیم سنت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب میں اِسی طرح رائج تھی۔ بائیبل میں بھی اِس کا ذکر اِسی حیثیت سے ہوا ہے۔ * * پیدایش ۱۲: ۳۴، خروج ۲۲: ۱۷۔ اِس کی یہ اہمیت کیوں ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

''۔۔۔ جس معاملے کے ساتھ ادائے مال کی شرط لگی ہو اور اُس ادائے مال کی حیثیت محض ایک نیکی اور احسان کی نہ ہو، بلکہ ایک فریضے کی ہو، یہاں تک کہ اگر اس کا ذکر نہ بھی ہو، جب بھی لازماً اسے موجود سمجھا جائے اور عورت کی حیثیت عرفی (سٹیٹس) کے اعتبار سے اُس کی ادائیگی واجب قرار پائے، قانون اور دستور کے لحاظ سے ایک اہم اور سنجیدہ معاملہ بن جاتا ہے۔ کوئی بھی ذی ہوش آدمی ایسے معاہدے میں ایک پارٹی بننے کی جرأت نہ کرے گا، جب تک وہ سو بار سوچ کر اُس میں شرکت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہ کرے ـــــ اِن ضرورتوں سے مہر کی شرط ضروری ہوئی۔ جن لوگوں کی نظر اِن ضرورتوں کی طرف نہیں گئی، وہ سمجھتے ہیں کہ اِس شرط نے عورت کو ایک قابل خرید و فروخت شے کے درجے تک گرا دیا ہے۔ اس لیے مہر کو عورت کی قیمت خیال کرنا محض ناسمجھی کا نتیجہ ہے۔ یہ شرط تو ایک علامت ہے کہ جو بھی عورت کے حرم

میں قدم رکھنا چاہیے، وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر قدم رکھے۔ نکاح و طلاق کے معاملے میں کسی مذاق کی گنجایش نہیں ہے۔ یہاں مذاق بھی حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۲۷۸)

فریقین کی پاک دامنی

اِس سے واضح ہے کہ نکاح کے لیے پاک دامن ہونا ضروری ہے۔ کوئی زانی یہ حق نہیں رکھتا کہ کسی پاک دامن سے بیاہ کرے اور نہ کوئی زانیہ یہ حق رکھتی ہے کہ کسی پاک دامن مرد کے نکاح میں آئے، الّا یہ کہ معاملہ عدالت میں نہ پہنچا ہو اور وہ توبہ و استغفار کے ذریعے سے اپنے آپ کو اِس گناہ سے پاک کر لیں۔

مہر کی مزید وضاحت

یہ ایک مخصوص رقم یا کوئی شے ہوتی ہے جو شوہر کو شادی کے وقت اپنی بیوی کو ادا کرنا ہوتی ہے یا وہ اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ وہ اسے بعد میں ادا کر دے گا۔ کچھ لوگوں نے بالکل غلط سمجھا ہے کہ مہر بیوی کو اپنانے کی رقم ہے جو شوہر کو ادا کرنی ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مہر اس ذمہ داری کا ایک علامتی اظہار ہے جو اسلام شوہر کے کندھوں پر ڈالتا ہے کہ وہ بیوی اور بچوں کی کفالت کرے گا۔ یہ اسی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے خاندان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کمائے۔ مہر اس ذمہ داری کا صرف ایک ٹوکن ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب ایک آدمی اس رقم کو ادا کرتا ہے تو وہ اس حقیقت کا معنوی اظہار کرتا ہے کہ وہ اس خاتون کی معاشی ذمہ داریاں اٹھائے گا جسے وہ بیوی بنا رہا ہے۔ لہٰذا اس معاہدے کی روح یہ ہے کہ وہ دلہن کو گھر لے جانے سے پہلے مقررہ مہر ادا کر دے۔

یہاں اس بات کو واضح کرنا بے محل نہ ہو گا کہ مہر کی رقم، جیسا کہ قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ معاشرے کے رواج اور دستور کو مد نظر رکھتے ہوئے مقرر کی جائے گی: وَاٰتُوْہُنَّ اُجُوْرَہُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ. (النساء ۴:۲۵)

''اور انھیں دستور کے مطابق ان کے مہر ادا کرو۔''

چنانچہ اسلام نے مہر کی کوئی خاص رقم مقرر نہیں کی اور اسے معاشرے کے رواج و دستور پر چھوڑ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے مہر ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مہر کی رقم مقرر کرتے وقت شوہر کی آمدنی اور بیوی کی معاشرتی حیثیت کو سامنے رکھا جانا چاہیے۔

(تسہیل: نعیم بلوچ)



ترجمہ و تحقیق: محمد حسن الیاس

کیا شگون لینا توہم پرستی ہے؟

عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ الْحَكَمِ السُّلَمِيِّ، قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ، أُمُورًا كُنَّا نَصْنَعُهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ، كُنَّا نَأْتِي الْكُهَّانَ، قَالَ: ''فَلَا تَأْتُوا الْكُهَّانَ''، قَالَ: قُلْتُ: كُنَّا نَتَطَيَّرُ، قَالَ: ''ذَاكَ شَيْءٌ يَجِدُهُ أَحَدُكُمْ فِي نَفْسِهِ، فَلَا يَصُدَّنَّكُمْ''، قَالَ: قُلْتُ: وَمِنَّا رِجَالٌ يَخُطُّونَ، قَالَ: ''كَانَ نَبِيٌّ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ يَخُطُّ، فَمَنْ وَافَقَ خَطَّهُ فَذَاكَ (صحیح مسلم، رقم ۴۱۴۰)

ترجمہ

معاویہ بن حکم سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ، ہم جاہلیت کے زمانے میں بعض کام کیا کرتے تھے۔ (اُنھی میں سے یہ بھی تھا کہ) ہم کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لیکن اب کاہنوں کے پاس مت جایا کرو۔'' کہتے ہیں کہ میں نے کہا: ہم برا شگون بھی لیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا: یہ ایک خیال ہی ہوتا ہے جو تم میں سے کسی کے دل میں گزرتا ہے، مگر تمھیں یہ کسی کام سے روکے نہیں۔ میں نے عرض کیا: ہم میں سے کچھ لوگ خط بھی کھینچتے تھے۔ اِس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ایک نبی بھی خط کھینچا کرتے تھے۔ جس کا خط اُس کے موافق ہو جائے، وہ یہ خط کھینچ لے۔

تشریح:

یہ علم رمل کا ذکر ہے، جس میں لکیروں اور ہندسوں کے ذریعے سے غیب کی باتیں بتانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

یہاں یہ واضح رہے کہ (نبی سے مراد حضرت مسیح علیہ السلام ہیں) غالباً اُسی طرح کا معجزہ تھا، جیسے مسیح علیہ السلام نے اپنے بارے میں فرمایا ہے کہ ”میں تمھیں بتا سکتا ہوں جو کچھ تم کھا کر آئے ہو اور جو کچھ اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو“ (آل عمران ۳:۴۹)۔

جس کا خط اُس کے موافق ہو جائے، وہ یہ خط کھینچ لے۔" یہ زجر (تنبیہ) کا جملہ ہے اور زجر کے طریقے پر اثبات سے انکار کا اسلوب" قرآن و حدیث میں بعض دوسرے مقامات پر بھی دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ سورۂ حج (۲۲) کی آیت ۱۵ میں ’فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَي السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ‘۔

(اِنھیں بتاؤ کہ) جو یہ گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں ہرگز اُس کی مدد نہ کرے گا۔ اُس کو چاہیے کہ (اپنے تصور میں ذرا) ایک رسی (اوپر چڑھنے کے لیے) آسمان کی طرف تانے، پھر (جب منزل کو بہت دور دیکھ کر رنجیدہ ہو تو) اُس کو کاٹ دے اور دیکھے کہ آیا اُس کی یہ تدبیر اُس کے رنج کو دور کرنے والی بنتی ہے؟

(حدیث میں) اِسی کی مثال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم میں سے کوئی نبوت کے منصب پر فائز کر دیا گیا ہے تو یہ کر لے، اِس لیے کہ اِس طریقے سے غیب کی خبریں بتانے کا معجزہ ایک پیغمبر کو دیا گیا تھا اور معجزات پیغمبروں ہی کو دیے جاتے ہیں۔ کسی دوسرے کی طرف سے اِس طرح کے دعوے محض اوہام ہیں، جن سے دور ہی رہنا چاہیے۔

اسی مضمون کی دیگر متعدد روایات میں ایک دوسری روایت کچھ یوں ہے:

صفیہ بنت ابو عبید سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں: میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ بیان کرتے تھے کہ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ نے فرمایا: جو شخص کسی نجومی کے پاس جائے کہ اُس سے کوئی سوال پوچھے، اُس کی چالیس شب و روز کی نمازیں قبول نہیں کی جاتیں۔

یعنی اِس گناہ کی سزا کے طور پر۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اوہام کی پیروی کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیسا سخت ہے۔



قصہ مختصر



مدیر کے قلم سے

عورت: ملکیت، شے یا انسان؟

عورت کے بارے میں انسانی معاشرے نے صدیوں میں بے شمار نظریات قائم کیے، بے شمار فلسفے تراشے اور اس کے مقام کے تعین کے لیے مذہب، روایت، تہذیب، خاندان اور جدید تحقیق؛ سب کو دلیل بنایا۔ لیکن اگر اس پوری بحث کو اس کی پیچیدگیوں سے نکال کر چند سادہ لفظوں میں بیان کیا جائے تو عورت کے بارے میں ہمارے رویوں کو تین بنیادی تصورات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: عورت ملکیت ہے، عورت شے ہے یا عورت انسان ہے۔

یہ تین جملے بظاہر بہت سادہ ہیں، لیکن عورت کی پوری سماجی تاریخ شاید انہی تین دائروں کے درمیان سفر کرتی رہی ہے۔

پہلا تصور عورت کو ملکیت سمجھتا ہے۔ اس تصور میں عورت کا احترام ضرور ہوتا ہے، لیکن اس احترام کی ایک قیمت ہوتی ہے: اطاعت۔ وہ بیٹی ہے تو اچھی بیٹی وہی ہے جو باپ کی مرضی کو اپنی مرضی سمجھے؛ بہن ہے تو خاندان کی عزت کا مقدس بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے؛ بیوی ہے تو شوہر کے تصورِ زندگی میں اپنی شخصیت تحلیل کر دے؛ اور ماں ہے تو اپنی پوری زندگی اگلی نسل کی تعمیر میں صرف کر دے۔ اس نظام میں عورت کو محبت، احترام، تحفظ، گھر، خاندان اور بڑھاپے کا سہارا مل سکتا ہے، لیکن اکثر اس کے بدلے اس سے اس کی خود اختیاری طلب کی جاتی ہے۔ گویا اسے عزت تو ملتی ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنے لیے زندگی کی تعریف خود نہ کرے۔ اس کی منزلیں خود متعین نہ کرے۔ وہ جتنا ایثار کرے گی جتنی قربانی کرے گی، اس کا مقام اسی نسبت سے متعین ہو گا۔

اسی ذہنیت کی انتہائی شکل عورت کو لونڈی بنا دیتی ہے۔ پھر اس کا جسم مرد کی ضرورت، اس کی محنت خاندان کی ضرورت، اس کی رائے مالک کی رائے کا تابع اور اس کی زندگی دوسروں کے فیصلوں کی تکمیل بن جاتی ہے۔ وہ بظاہر خاندان کا مرکز ہوتی ہے، لیکن اپنی ہی زندگی کے فیصلوں میں بسا اوقات حاشیے پر کھڑی ہوتی ہے۔

دوسرا تصور عورت کو کھلونا یا شے بنا دیتا ہے۔ یہ بظاہر پہلے تصور کی ضد معلوم ہوتا ہے، مگر غور کیجیے تو دونوں میں ایک حیرت انگیز مماثلت موجود ہے: دونوں عورت کو اس کی مکمل انسانی شخصیت کے بجائے اس کی افادیت سے دیکھتے ہیں۔ پہلے نظام میں عورت شوہر کی ملکیت تھی، دوسرے میں وہ مارکیٹ کی شے بن سکتی ہے۔ وہاں اس سے اطاعت مطلوب تھی، یہاں اس سے کشش مطلوب ہے۔ وہاں اس کی قیمت اس کی فرمانبرداری سے لگائی جاتی تھی، یہاں اس کے جسم، حسن، جوانی اور جنسی کشش سے لگ سکتی ہے۔

یہ دوسرا استحصال زیادہ چمک دار ہے۔ اس کے گرد روشنی ہے، شہرت ہے، دولت بھی ہے اور آزادی کا غیر حقیقی تاثر بھی؛ لیکن اگر عورت کی قدر کا بنیادی پیمانہ اس کا جسم اور اس کی کشش بن جائے تو جوانی ڈھلنے کے ساتھ اس بازار کی بے رحمی بھی سامنے آنے لگتی ہے۔ جس صنعت نے اسے استعمال کیا تھا، وہ کسی نئی اور کم عمر عورت کی تلاش شروع کر دیتی ہے۔ بعض صورتوں میں استحصال کا شکار شخص خود اسی نظام کا حصہ بن کر دوسروں کے استحصال میں شریک بھی ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ کسی عورت کی لازمی تقدیر نہیں؛ اصل تنقید اس معاشی و ثقافتی نظام پر ہونی چاہیے جو انسان کو انسان کے بجائے قابلِ فروخت شے بنا دیتا ہے۔

ہمارے خیال میں تیسرا راستہ سب سے بنیادی سوال اٹھاتا ہے؛ عورت آخر ہے کیا؟

جواب بہت سادہ ہے۔: وہ انسان ہے

ایک مضبوط عورت وہ نہیں جو مرد سے نفرت کرنا سیکھ لے، اور نہ وہ جو مرد کی نقل کر کے اپنی نسوانی شناخت سے دست بردار ہو جائے۔ مضبوط عورت وہ ہے جو اپنی شخصیت کو کسی دوسرے انسان کی ملکیت بننے سے بچا سکے اور کسی بازار کی شے بننے سے بھی۔

وہ تعلیم حاصل کرے، ہنر پیدا کرے، معاشی طور پر اس حد تک با اختیار ہو کہ محض روٹی، مکان یا تحفظ کی خاطر کسی ناگوار اور غیر مطلوب تعلق میں رہنے پر مجبور نہ ہو۔ وہ اپنی شادی کے فیصلے میں صاحبِ رائے ہو۔ وہ شریکِ حیات کا انتخاب کرے تو ضرورت اور بے بسی کے تحت نہیں بلکہ شعوری رفاقت کے طور پر کرے۔ اور اگر کسی مرحلے پر وہ تنہا ہو تو اس کی تنہائی اسے بے وقار، بے شناخت یا بے سہارا انسان میں تبدیل نہ کر دے۔

اصل آزادی شاید یہی ہے۔

عورت کی آزادی کو بھی عجیب خانوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ایک طبقہ سمجھتا ہے عورت محفوظ صرف اس وقت ہے جب کوئی مرد اس کا محافظ ہو؛ دوسرا سمجھتا ہے وہ آزاد صرف اس وقت ہے جب وہ تمام روایتی رشتوں سے بغاوت کر دے۔ حالاں کہ آزادی ان دونوں انتہاؤں سے مختلف چیز ہے۔ آزادی دراصل انتخاب کی قوت ہے۔ عورت بیٹی بنے تو اپنی شخصیت کے ساتھ، بیوی بنے تو اپنی رضا کے ساتھ، ماں بنے تو اپنے وقار کے ساتھ، اور اگر وہ شادی نہ کرے یا کسی دور میں تنہا زندگی گزارے تو تب بھی اس کی شناخت مکمل انسان کی شناخت رہے۔

اسے باپ کی محبت چاہیے، لیکن اپنی عقل کی قیمت پر نہیں۔ اسے شوہر کی رفاقت چاہیے، لیکن اپنی عزتِ نفس کے بدلے نہیں۔ اسے اولاد کی محبت چاہیے، لیکن اپنی پوری شخصیت مٹا کر نہیں۔ اور اسے معاشرے کا احترام چاہیے، لیکن اس شرط پر نہیں کہ معاشرہ پہلے یہ طے کرے کہ اسے کس سانچے میں زندہ رہنا ہے۔

یہاں ایک بات اور سمجھنا ضروری ہے۔ عورت کو مضبوط بنانے کا مطلب خاندان کو کمزور کرنا نہیں۔ اس کے برعکس، دو آزاد، ذمہ دار اور باوقار انسانوں کا بنایا ہوا خاندان اس خاندان سے زیادہ مضبوط ہو سکتا ہے جس میں ایک حاکم اور دوسرا تابع ہو۔ ہاں، خاندان میں اختیار کا دائرہ کار متعین ہو جائے تو اختلافات کی صورت میں موافقت کا رستہ ممکن ہو جاتا ہے۔ یہی چیز خاندان کے بکھرنے کو روک دیتا ہے۔

محبت کا سب سے خوب صورت رشتہ وہی ہے جس میں کسی کو دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور نہ کیا گیا ہو، بلکہ دونوں ایک دوسرے کو اختیار کے باوجود منتخب کرتے ہوں۔

ہمیں اپنی بیٹیوں کو صرف یہ نہیں سکھانا چاہیے کہ اچھا شوہر کیسے ملتا ہے؛ ہمیں انھیں یہ بھی سکھانا چاہیے کہ اچھی زندگی کیسے بنائی جاتی ہے۔ انھیں صرف محفوظ رکھنے کی کوشش کافی نہیں، انھیں اتنا مضبوط بنانا بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی حفاظت، اپنے فیصلے اور اپنے مستقبل میں فعال کردار ادا کر سکیں۔ تعلیم، معاشی قابلیت، قانونی شعور، جذباتی پختگی اور عزتِ نفس؛ یہ سب عورت کی شخصیت کے حفاظتی حصار ہیں۔

اور شاید عورت کے مسئلے کا سب سے مختصر حل بھی یہی ہے۔

اسے ملکیت نہ بنائیے۔

اسے کھلونا یا شے نہ بنائیے۔

اسے انسان رہنے دیجیے۔

وہ انسان جو کل کو اللہ کی سلطنت کی باوقار شہریت کی مستحق ہو۔

وہ انسان جو محبت بھی کر سکتی ہے، خاندان بھی بنا سکتی ہے، ماں بھی بن سکتی ہے، علم بھی پیدا کر سکتی ہے، معیشت میں حصہ بھی ڈال سکتی ہے، قیادت بھی کر سکتی ہے، غلطی بھی کر سکتی ہے، اپنی غلطی سے سیکھ بھی سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر اپنی زندگی کو ایک ایسی معنویت دے سکتی ہے جس کا فیصلہ محض اس کا باپ، شوہر، معاشرہ یا بازار نہ کرے۔

عورت کی اصل آزادی مرد سے آزادی نہیں؛ مجبوری سے آزادی ہے۔

اور اس کا اصل وقار یہ نہیں کہ اسے کسی مرد کے سہارے کی کبھی ضرورت نہ پڑے؛ انسان بہر حال انسانوں کے سہارے سے زندہ رہتے ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کہ مرد اور عورت ایک وجود کے دو حصے ہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں۔ اصل وقار یہ ہے کہ اسے کسی مرد کا سہارا صرف اس لیے قبول کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑے کہ وہ عورت ہے۔

یہ فرق معمولی نہیں۔

عورت کے بارے میں ہماری پوری بحث اسی ایک فرق سے بدل سکتی ہے۔





نعیم احمد بلوچ

ام عمارہ نسیبہ بنت کعب: اُحد سے یمامہ کے میدان تک

اس نامور کاخاتون کا ایمان افروز ذکر جنھوں نے گھر سے باہر قدم رکھا؛ میدان جنگ میں سب سے زیادہ زخم کھائے، غازی بنیں اور اسلامی تاریخ کی نامور ترین مجاہدہ قرار پائیں۔

اُحد کا میدان اچانک بدل چکا تھا۔

کچھ دیر پہلے تک فتح مسلمانوں کے قدم چومتی دکھائی دیتی تھی، مگر اب پہاڑ کے دامن میں گرد کا ایک طوفان تھا، گھوڑوں کی ٹاپیں تھیں، تلواروں کی جھنکار تھی اور ایک ایسا اضطراب جس میں دوست اور دشمن کی پہچان مشکل ہوتی جارہی تھی۔ تیر اندازوں کی جگہ خالی ہونے کے بعد دشمن کے سوار عقب سے پلٹ آئے تھے۔ مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہو چکی تھیں۔ یہاں تک کہ کسی دشمن نے پکار دیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہوگئے۔ دل ٹوٹ گئے، حوصلے چھوٹ گئے۔ بہت سے لوگ منتشر ہوگئے اور دشمن کے چند بڑے سورما ایک ہدف کی طرف بڑھنے لگے جس تک پہنچ جانا ان کے نزدیک جنگ کا فیصلہ کر دینے کے مترادف تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اسی ہنگامے میں ایک عورت بھی میدان میں موجود تھی۔

اگرچہ وہ جنگ کرنے نہیں آئی تھی۔ اس کے کندھے پر پانی کی مشک تھی۔ وہ زخمیوں کو پانی پلانے اور مجاہدین کی مدد کرنے آئی تھی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ حالات پلٹ گئے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد مدافعین کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے تو اس عورت نے پانی کی مشک چھوڑ دی۔

اب اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔

وہ نسیبہ بنت کعبؓ، اُمِّ عمارہ تھیں۔



ابن سعد نے ان ہی کی زبانی یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ میں دن کے آغاز میں پانی کی مشک لے کر نکلی تھی۔ مسلمان غالب تھے، لیکن جب وہ منتشر ہونے لگے تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آگئی:

”فجعلت أباشر القتال وأذب عن رسول الله بالسيف وأرمي بالقوس“

میں خود لڑنے لگی، تلوار کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کرتی اور کمان سے تیر چلاتی رہی، یہاں تک کہ مجھے زخم پہنچے۔

قریش کا ابن قمیئہ جو اللہ کے رسول کو بطور خاص ہدف بنانا چاہتا تھا، ان کی تلاش میں بڑھ رہا تھا۔ روایت کے مطابق وہ پکار رہا تھا کہ مجھے محمد تک پہنچاؤ؛ اگر وہ بچ گئے تو میں نہ بچوں۔ مصعب بن عمیرؓ اور چند دوسرے لوگ اس کے سامنے آ گئے۔ نسیبہؓ بھی انہی میں تھیں۔ دو بدو جھڑپ ہوئی۔ یہ جھڑپ بتاتی ہے کہ نسیبہ تلوار چلانا خوب جانتی تھیں۔

ابن قمیئہ نے ان کے کندھے پر تلوار ماری۔

وار ایسا گہرا تھا کہ بعد میں جب اُم سعد نے نسیبہؓ کے کندھے کا زخم دیکھا تو اس نے اسے گہرا اور کھلا ہوا زخم قرار دیا۔ نسیبہؓ نے بتایا کہ یہی ابن قمیئہ کا وار تھا۔ انہوں نے بھی جواب میں اس پر کئی وار کیے، لیکن وہ دو زرہیں پہنے ہوئے تھا۔ یہ زخم اتنا شدید تھا کہ ایک روایت کے مطابق تقریباً ایک سال تک اس کا علاج ہوتا رہا۔

مغازی کی ایک مشہور روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظ منقول ہیں:

''ما التفتُّ يمينًا ولا شمالًا إلا وأنا أراها تقاتل دوني''

اُحد کے دن میں دائیں یا بائیں جدھر بھی دیکھتا، اسے اپنے دفاع میں لڑتے ہوئے پاتا۔

یہ روایت واقدی کے طریق سے آئی ہے، اس لیے اسے صحیح حدیث کا درجہ حاصل نہیں؛ البتہ ابن سعد اور بلاذری جیسے قدیم مؤرخین نے اسے اپنی تاریخی روایت میں محفوظ کیا ہے۔ اور سیاق وسباق اس بات کو درست ماننے میں مانع نہیں۔

اُحد کی شام تک نسیبہ بنت کعبؓ کے جسم پر ایک روایت کے مطابق بارہ اور دوسری کے مطابق تیرہ زخم تھے۔

لیکن ان کی کہانی اُحد سے شروع نہیں ہوئی تھی۔

عقبہ کی رات

نسیبہ کا تعلق مدینہ کے بنو مازن بن نجار سے تھا۔ انصار کا یہی وہ معاشرہ تھا جس میں آنے والے برسوں میں اسلام کو وہ انسانی اور سیاسی قوت میسر آنے والی تھی جو مکہ میں دستیاب نہیں تھی۔ ابن سعد ان کا نسب نسیبہ بنت کعب بن عمرو بیان کرتے اور ان کی کنیت اُمِّ عمارہ لکھتے ہیں۔

ہمیں یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے پہلی مرتبہ قرآن کب سنا، کس داعی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور ایمان کی وہ پہلی ساعت ان پر کیسے گزری۔ یہاں تاریخ خاموش ہے اور جہاں تاریخ خاموش ہو وہاں تخیل کو واقعہ بنا دینا مناسب نہیں۔

لیکن اگلی منزل پوری طرح روشن ہے۔

ہجرت سے پہلے مدینہ کے مسلمانوں کا ایک بڑا وفد مکہ آیا۔ رات کے اندھیرے میں عقبہ کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی۔ یہی بیعتِ عقبہ ثانیہ تھی۔ اس اجتماع میں ستر سے زیادہ مردوں کے ساتھ دو عورتیں بھی موجود تھیں۔ ان میں سے ایک نسیبہ بنت کعب تھیں۔

یہ محض قبولِ اسلام کا اعلان نہیں تھا۔ اہلِ یثرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شہر آنے کی دعوت دے رہے تھے اور آپ کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر رہے تھے۔ گویا ایک نئی مسلم اجتماعیت کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔

اور اس تاریخی عہد میں نسیبہ بھی شریک تھیں۔

ابن اسحاق کی روایت اور بعد کے سیرت نگار انہیں بیعتِ عقبہ میں شریک دو خواتین میں شمار کرتے ہیں۔ ابن سعد بھی لکھتے ہیں کہ انہوں نے عقبہ کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔

یوں نسیبہ کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اُحد سے پہلے عقبہ کو یاد رکھنا ضروری ہے۔ اُحد میں انہوں نے جس جان کی حفاظت کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالی، عقبہ میں اسی جان کی حفاظت کا عہد کیا تھا۔

مدینہ کی ایک فعال مسلمان عورت

ہجرت ہوئی اور یثرب مدینۃ النبی بن گیا۔

یہیں نسیبہ کی شخصیت کا دوسرا پہلو سامنے آتا ہے۔ وہ صرف ایک جنگجو عورت نہیں تھیں۔ ان کی اصل

شخصیت ایک ایسی انصاری مسلمان خاتون کی ہے جو خاندان، عبادت، سماجی خدمت، سیاسی بیعت اور ضرورت پڑنے پر دفاع؛ سب میں شریک دکھائی دیتی ہیں۔

ان کی اولاد میں عبداللہ اور حبیب خاص طور پر معروف ہوئے۔ دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی۔ بعد میں نسیبہ خود بھی احادیث روایت کرنے والی صحابیہ کے طور پر سامنے آئیں۔ ابن حجر نے ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے خاندان کے افراد سمیت متعدد راویوں کا ذکر کیا ہے، اور ان کی روایات ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور ابو داؤد تک پہنچی ہیں۔

اس لیے انہیں صرف ''مسلمان خاتون سپاہی'' کہنا ان کی شخصیت کو محدود کر دینا ہو گا۔ وہ بیعت کرنے والی شہری، ماں، راویۂ حدیث، خدمت گزار اور مدافع رسول سمیت سب کچھ تھیں۔

اور پھر 3 ہجری میں اُحد آ گیا۔

پانی کی مشک سے تلوار تک

نسیبہ ابتدا میں اُحد میں باقاعدہ سپاہی کی حیثیت سے نہیں نکلی تھیں۔ ان کی اپنی روایت صاف بتاتی ہے کہ وہ پانی پلانے گئی تھیں۔

یہ فرق اہم ہے۔

اسلامی معاشرے میں خواتین کی جنگی شرکت کی بحث میں نسیبہ کی مثال پیش کرتے ہوئے کبھی کبھی یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ وہ کسی مستقل فوجی دستے کی رکن تھیں۔ دستیاب اولین روایت ایسا نہیں بتاتی۔ وہ خدمت کے لیے نکلیں؛ لیکن جب صورت حال نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کو براہ راست خطرے میں ڈال دیا تو ان کا کردار بدل گیا۔

اب وہ پانی پلانے والی نہیں رہیں۔

وہ محافظِ رسول بن گئیں۔

ایک روایت میں وہ بتاتی ہیں کہ جب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد سے منتشر ہوئے تو بہت تھوڑے لوگ باقی رہ گئے۔ نسیبہ، ان کے شوہر زید بن عاصم اور ان کے بیٹے حبیب بن زید آپ کے قریب ہی لڑ رہے تھے۔

ان کے پاس ابتدا میں ڈھال بھی نہ تھی۔ مگر پھر یہ ہوا ایک مسلمان کسی وجہ سے پیچھے ہٹا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے آواز دی:

''الق ترسک الی من یقاتل'' (سیر اعلام النبلاء)

اپنی ڈھال اسے دو جو لڑ رہا ہے۔

اس نے ڈھال پھینکی اور نسیبہ نے وہ ڈھال اٹھالی۔ پھر ایک سوار نے ان پر حملہ کیا۔ انہوں نے ڈھال سے وار روکا، اس کے گھوڑے کو زخمی کیا اور مقابلہ جاری رکھا۔ روایات بتاتی ہیں کہ وہ ان لوگوں میں موجود رہیں جو حضور کی حفاظت میں آخری وقت تک لڑتے رہے۔ پھر ابن قمئیہ نے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے اعلان کر دیا کہ محمد ﷺ شہید ہو گئے ہیں۔ یوں کفار کو غلط فہمی ہوئی اور وہ سارے واپس چلے گئے۔ نسیبہ اس وقت تک وہیں رہیں۔

یہ تفصیلات ابن سعد اور بعد میں ذہبی نے محفوظ کی ہیں۔

یہاں نسیبہ کی بہادری کا ایک اور رخ سامنے آتا ہے۔ وہ اکیلی نہیں لڑ رہی تھیں۔ ان کا خاندان لڑ رہا تھا۔ شوہر میدان میں تھے، بیٹے میدان میں تھے اور ماں بھی میدان میں تھی۔ ایک بیٹا زخمی ہوا تو روایت کے مطابق نسیبہ نے اس کا زخم باندھا اور اسے دوبارہ مقابلے کے لیے بھیج دیا۔

یہ منظر نسیبہ کی پوری شخصیت کو ایک تصویر میں سمیٹ دیتا ہے: ایک ہاتھ سے بیٹے کا زخم باندھنے والی ماں اور دوسرے لمحے دشمن کے مقابل تلوار اٹھانے والی مجاہدہ۔

اُحد کے بعد

اُحد کا سب سے گہرا زخم ان کے کندھے پر تھا۔ خون اتنا بہا کہ جب اگلے روز حمراء الاسد کے لیے منادی ہوئی تو انہوں نے زخم باندھ کر نکلنے کی کوشش کی، لیکن خون بہنے کے باعث نہ جا سکیں۔

دراصل حضور کو خبر پہنچی کہ ابو سفیان لشکر سمیت مدینہ پر حملے کے لیے الروحا کے مقام پر رک گیا ہے۔ چنانچہ حضور نے اس کی سرکوبی کے لیے اس کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور قریبی مقام حمراء الاسد پہنچے۔ ابو سفیان کو معلوم ہوا تو اس کے چھکے چھوٹ گئے اور وہ واپس مکہ بھاگ اٹھا۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حمراء الاسد سے واپس آئے تو گھر پہنچنے سے پہلے نسیبہ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے آدمی بھیجا۔

جب ان کی سلامتی کی خبر ملی تو آپ خوش ہوئے۔

بعد کے حالات سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ نسیبہ حدیبیہ، خیبر، عمرۃ القضاء، حنین اور پھر یمامہ میں بھی اسلامی لشکر کا حصہ رہیں۔ ابن سعد اور ابن حجر دونوں یہ فہرست نقل کرتے ہیں۔

حضور ﷺ کی میزبان

نسیبہؓ سے منقول ایک روایت کے مطابق ایک دن رسول اللہ ﷺ ان کے گھر تشریف لائے۔ انہوں نے آپ ﷺ کے سامنے کھانا پیش کیا۔ آپ نے انہیں بھی کھانے کے لیے فرمایا تو عرض کیا: میں روزے سے ہوں۔ آپ نے انہیں یہ بشارت دی کہ جب کسی روزہ دار کے پاس دوسرے لوگ کھانا کھاتے ہیں تو کھانے سے فارغ ہونے تک فرشتے اس کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں۔ یہ روایت ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں منقول ہے۔

یہ واقعہ نسیبہؓ کی شخصیت میں ایک بہت خوب صورت انسانی توازن پیدا کرتا ہے۔ اُحد میں ہم انہیں تلوار اور ڈھال کے ساتھ دیکھتے ہیں؛ یہاں وہ اپنے گھر میں رسول اللہ ﷺ کی میزبانی کرنے والی، خود روزے سے رہ کر مہمان کو کھانا پیش کرنے والی خاتون ہیں۔

لیکن ان کی زندگی کا سب سے المناک باب ابھی باقی تھا۔

ایک ماں اور مسیلمہ کذّاب

مسیلمہ نے اپنی جھوٹی نبوت کا اعلان حضور کی زندگی ہی میں کر دیا تھا لیکن پھر آپ کی وفات کے بعد اس نے بغاوت کا پرچم بھی بلند کر دیا۔ خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ جنگ کے ابتدائی دنوں میں مسیلمہ کو کچھ کامیابیاں بھی ملیں۔ ایک جھڑپ میں اس نے نسیبہ کے بیٹے حبیب کو گرفتار کر لیا۔ تاریخی بیان کے مطابق مسیلمہ نے حبیب سے پوچھا:

کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد اللہ کے رسول ہیں؟

حبیب نے کہا: ہاں۔

پھر پوچھا:

کیا تم گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟

حبیب نے پوری سختی سے انکار کیا۔

یہ سوال بار بار دہرایا گیا اور حبیب اپنے جواب پر قائم رہے۔ مسیلمہ نے انہیں اذیت دے کر مجبور کرتا رہا کہ وہ اس کی جھوٹی نبوت کا اقرار کریں مگر وہ ثابت قدم رہے۔ تب انھیں شہید کر دیا گیا۔ ابن اسحاق سے منقول یہ واقعہ ابن کثیر اور دوسرے سیرت نگاروں نے بھی محفوظ کیا ہے۔

اُحد میں جس عورت نے اپنے جسم پر تلواریں روک لی تھیں، اب اسے ایک ایسا زخم ملا تھا جس پر کوئی مرہم نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

اس کا بیٹا شہید کر دیا گیا تھا۔ لیکن نسیبہ کی زندگی اس زخم کے بعد آگے بڑھتی رہی۔

وہ اب اُحد کے وقت کی طرح ایک جوان عورت نہیں تھیں۔ کئی برس گزر چکے تھے۔ جسم پر پرانے زخموں کے نشان بھی موجود تھے اور دل میں حبیب کا زخم تھا۔ مگر یمامہ کے میدان میں وہ پھر موجود تھیں۔

روایات کے مطابق انہوں نے وہاں براہ راست جنگ میں حصہ لیا۔ انہیں متعدد نئے زخم آئے اور ان کا ایک ہاتھ کٹ گیا۔ ابن حجر ان کے یمامہ میں زخمی ہونے اور ہاتھ کٹنے کا ذکر کرتے ہیں، جبکہ ابن اسحاق سے منقول روایت میں ان کے جسم پر متعدد زخموں کا ذکر ہے۔

مسیلمہ اسی جنگ میں مارا گیا۔

تاریخ نے شاید اس منظر کے تمام الفاظ محفوظ نہیں کیے، مگر تصویر مکمل تھی:

وہ عورت جو عقبہ کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھڑی تھی؛

جو اُحد میں آپ کے سامنے ڈھال بن گئی تھی؛

جس کے بیٹے کو جھوٹی نبوت کے مدعی نے شہید کر ڈالا؛

اب اسی مدعی کے خلاف آخری جنگ میں اپنا ایک ہاتھ چھوڑ کر مدینہ واپس آ رہی تھی۔

آخری منظر

وہ میدان سے زندہ واپس آئیں—ایک ہاتھ کھو چکی تھیں اور جسم پر گیارہ نئے زخم تھے۔ مدینہ پہنچیں تو ابھی زخم تازہ تھے۔ محمد بن یحییٰ بن حبان کی روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ، جو اب خلیفۂ رسول تھے، ان کی عیادت کے لیے ان کے گھر آیا کرتے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ خلافتِ صدیقی ختم ہوئی اور عہدِ فاروقی آیا۔ نسیبہؓ اب بھی مدینے میں موجود تھیں۔ ابن سعد نے یہ واقعہ محفوظ کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس کچھ قیمتی چادریں آئیں۔ ان میں ایک عمدہ اور کشادہ چادر بھی تھی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ اسے عبداللہ بن عمرؓ کی اہلیہ صفیہ بنت ابی عبید کو بھیج دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اسے اس خاتون کے پاس بھیجو جو اس سے زیادہ اس کی حق دار ہے۔۔۔۔ اُمِّ عمارہ نسیبہ بنت کعب۔ یعنی فاروق اعظم نے اپنی بہو پر انھیں فوقیت دی!

گویا اُحد کو بیٹے برس گزر چکے تھے، لیکن مدینہ نسیبہ کو نہیں بھولا تھا۔

اور پھر ایک دن اس غیر معمولی زندگی کا اختتام آ گیا۔

ان کی وفات کی متعین تاریخ اور سبب کے بارے میں قدیم مصادر ہمیں پوری قطعیت فراہم نہیں کرتے۔ بعد کے بعض اہلِ سیر ان کی وفات تقریباً 13ھ کے آس پاس بیان کرتے ہیں، لیکن اس تاریخ کو یقینی قرار دینا مشکل ہے۔ البتہ ان کی وفات سے متعلق ایک روایت نے تاریخ کے لیے ایک نہایت معنی خیز منظر محفوظ کر دیا ہے۔

وہ خاتون جو نسیبہؓ کی وفات کے وقت ان کے غسل میں شریک تھی، بیان کرتی ہے:

"جب نسیبہ کی وفات کا وقت آیا تو میں ان لوگوں میں شامل تھی جنھوں نے انہیں غسل دیا۔ میں نے ان کے زخم ایک ایک کر کے گنے۔۔ وہ تیرہ تھے۔"

یہاں نسیبہ بنت کعبؓ کی داستان کو شاید کسی اور جملے کی ضرورت نہیں رہتی۔

غسل دینے والی عورت کے سامنے ایک خاموش جسم تھا، لیکن اس جسم پر ایک پوری تاریخ لکھی ہوئی تھی۔

کوئی نشان اُحد کی اس دوپہر کی یادگار تھا جب مسلمانوں کی صفیں ٹوٹ گئی تھیں اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑی ہو گئی تھیں۔ کوئی زخم ابن قمیئہ کی تلوار کی یاد تھا۔ کہیں حنین اور دوسرے معرکوں کی یادیں ہوں گی، اور ایک ہاتھ یمامہ کے میدان میں رہ گیا تھا—اس میدان میں جہاں وہ اس مسیلمہ کے خلاف لڑنے پہنچی تھیں جس کے ہاتھوں ان کا بیٹا حبیب بن زیدؓ قتل ہوا تھا۔

عقبہ کی اس رات سے، جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، زندگی کے آخری لمحے تک ان کا سفر ایک ہی عہد کی تکمیل دکھائی دیتا ہے۔

آخر میں ہم نسیبہ بنت کعب کی زندگی کو ایک اور پہلو سے دیکھتے ہیں:

اگر عہدِ رسالت کی ایک مسلمان عورت عقبہ کی بیعت میں شریک ہو سکتی تھی، اُحد میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے ڈھال بن سکتی تھی، حدیبیہ کے اجتماعی عہد میں موجود ہو سکتی تھی اور یمامہ تک پہنچ سکتی تھی، حکمران وقت اس کی تیمارداری کر سکتے تھے، اسے تحفہ دے سکتے تھے تو پھر یہ تصور کہاں سے پیدا ہوا کہ ایک صالح مسلمان عورت کی فضیلت کا لازمی تقاضا معاشرے کی عملی زندگی سے اس کا غائب ہو جانا ہے؟ اور اس کا دائرہ کار صرف گھر ہے!





وجیہہ حسان واحدی

ہماری اولاد کس کے نقشِ قدم پر؟

آج کے لڑکے اور لڑکیاں کن سے سیکھ رہے ہیں؟

آج سے کچھ عرصہ پہلے تک، عمومی تور پر، ایک بچے کی زندگی میں "رول ماڈل" کا مطلب ہوتا تھا اس کے والدین، اس کے دادا دادی، نانا نانی، یا محلے کے بزرگ۔ کچھ بچے تو کتابی کرداروں کو اپنا رول ماڈل مانتے تھے جیسے "ارژنگ"!

لیکن آج ایک کلک کی دوری پر لاکھوں "انفلوئنسرز" موجود ہیں، جن کے کردار کو تو اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ ہمارے بیٹے، بیٹیاں، بھائی، بہنیں، اور شاگرد انہیں دیکھ کر، روز، اپنی سوچ، اپنا انداز، اور کبھی کبھار اپنی اقدار بھی تشکیل دے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ رجحان واقعی اتنا گہرا اثر رکھتا ہے جتنا ہمیں محسوس ہوتا ہے؟ کیا یہ تاثر حقیقت پر مبنی ہے؟

سچ یہ ہے کہ اس سوال کا جواب نہ مکمل "ہاں" ہے نہ مکمل "نہیں"۔ "سوشل میڈیا پر وقت گزارنا نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کی خودی، اپنی شخصیت کے بارے میں تاثر، اور موازنے کے احساس کو متاثر کرتا ہے" — یہ بات کئی نفسیاتی مطالعوں میں سامنے آئی ہے۔ لڑکیوں کے لیے یہ اثر اکثر ظاہری خوبصورتی اور طرزِ زندگی کی نمائش کی صورت میں آتا ہے، جبکہ لڑکوں کے لیے یہ دولت، طاقت، یا نام نہاد "مردانگی" کے مصنوعی معیارات کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی اتنی ہی سچ ہے کہ ہر انفلوئنسر منفی اثر نہیں رکھتا۔

بہت سے مرد و خواتین سوشل میڈیا کو تعلیم، ہنر، کاروبار، اور دینی شعور پھیلانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

اصل مسئلہ "سوشل میڈیا" نہیں بلکہ معیار کا فقدان ہے۔ جب کسی نوجوان کے سامنے یہ طے کرنے کا کوئی پیمانہ ہی نہ ہو کہ کس کی پیروی قابلِ قدر ہے اور کس کی نہیں، تو وہ سب سے زیادہ نمایاں، سب سے زیادہ چمکدار چہرے کی طرف کھنچ جاتا ہے—چاہے اس کے پیچھے کوئی حقیقی اخلاقی وزن ہو یا نہیں۔ یہ خلا اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب گھر، اسکول، اور معاشرے میں مضبوط، قابلِ رسائی اور قابلِ تقلید کردار کم پڑ جائیں۔ جب بزرگ ہی "انفلوئنسر" تھے

ہماری دادی اور نانی میں سے بہت سے باقاعدہ اسکول نہیں گئیں تھیں، ڈگریاں نہیں رکھتی تھیں، مگر ان کے پاس ایک ایسی دولت تھی جو کتابوں سے نہیں، تجربے اور صبر سے حاصل ہوتی ہے—حکمت!

وہ جانتی تھیں کہ مشکل وقت میں کیسے ڈٹے رہنا ہے، رشتے کیسے نبھانے ہیں، اپنی بات بغیر اپنی وقار کو کھوئے، کیسے کہنی ہے، تھوڑے میں کیسے راضی رہنا ہے۔ ان کی نصیحتیں مختصر ہوتی تھیں مگر گہری—"صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے"، "اپنی عزت خود بناؤ، دوسروں کے بھروسے مت رکھو"، "جو دکھتا ہے وہ ہمیشہ سچ نہیں ہوتا"۔

آج کی نسل کو ایسی آوازیں کم سننے کو ملتی ہیں، کیونکہ خاندانی نظام میں فاصلے بڑھ گئے ہیں، مشترکہ خاندان کم ہوتے جا رہے ہیں، اور اسکرین کی موجودگی اور استعمال، خاندان کی بیٹھک سے زیادہ پرسکون لگتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ حکمت کی جگہ "ٹرینڈز" لے رہے ہیں—اور یہ فرق لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو یکساں طور پر متاثر کرتا ہے۔



ایک چھوٹی سی کہانی—زینب اور بلال کی

زینب سولہ برس کی تھی، پڑھائی میں اوسط، مگر سوشل میڈیا پر بہت متحرک۔ اس کی پسندیدہ آن لائن شخصیت ایک لڑکی تھی جو ہر ہفتے نئے کپڑے، نئے مہنگے کیفے، اور "پرفیکٹ زندگی" دکھاتی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی بلال، بارہ برس کا، ایسے پیجز فالو کرتا تھا جو امیر بچوں کی زندگی کے دن دکھاتے، مہنگی ترین سپورٹز گاڑیوں میں گھومتے، اس کی عمر کے بچے، اور دوسروں کو پرانک (یعنی بے وقوف بنانے) کرنے کے طریقوں سے بھرے ہوتے تھے۔ دونوں بہن بھائیوں کو الگ الگ انداز میں لگتا تھا کہ کامیابی کا مطلب یہی ہے یا اس سے بہتر انٹرٹینمنٹ نہیں ہو سکتی—نمائش، توجہ، اور تعریف کے کمنٹس۔ بس ساری توجہ اس پر ہے۔

ایک دن ان کی نانی ان کو دونوں کو فون میں مصروف دیکھ رہی تھیں۔ نانی نے کوئی لیکچر نہیں دیا۔ بس اتنا پوچھا: "بیٹا، یہ جسے تم دیکھ رہے ہو، اس نے زندگی میں کس کی مدد کی ہے؟ کسی کو کچھ سکھایا ہے؟" دونوں کے پاس کوئی وزنی جواب تو نہیں تھا، لہٰذہ ادھر اُدھر کے جواب دے کر چپ ہو گئے۔ ایک سوال اپنی بیٹی سے بھی پوچھا:

"کیا بچے اسکرین کی تربیت سے بہتر انسان بنیں گے یا تمہاری تربیت سے؟"

اگلے دنوں میں نانی نے انہیں اپنی جوانی کے قصے سنائے—کیسے انہوں نے اور ان کے شوہر نے مشکل حالات میں گھر سنبھالا، کیسے نانا نے پوری زندگی دیانت داری سے کاروبار کیا حالانکہ بد دیانتی میں زیادہ منافع تھا، اور کیسے وہ آج بھی محلے میں عزت پاتے ہیں۔ حضرت یوسف کی داستان، حضرت یونس کے قصے کی گہرائی۔

ہر بچہ کی فطرت میں یہ عقیدہ موجود ہوتا ہے کہ اصل بڑائی کس کو کہتے ہیں لیکن اس کی مثالیں مستقل طور پر دیکھنا اور اپنے بڑوں سے سننا بہت ضروری ہے۔ امی نے اپنا رجحان بچوں کی طرف زیادہ کیا۔ زینب اور بلال نے آہستہ آہستہ اس بات کو اہمیت دینی شروع کی کہ عزت اور اثر کی اصل بنیاد نمائش نہیں، انسان کا اصل کردار اور کسی کے کام آنا ہے۔

کہانی کا اختتام ڈرامائی نہیں۔ نہ زینب نے سوشل میڈیا چھوڑا، نہ بلال نے۔ مگر دونوں نے نانی، اپنی امی اور ابو کے ساتھ اپنے شام کا وقت گزارنا زیادہ کر دیا۔ نانی سے پرانے قصوں کی فرمائش زیادہ ہو گئی۔ ابو سے بین الاقوامی معاملات پر گفتگو بڑھ گئی۔ شام میں امی کے ساتھ بورڈ گیمز کی محفلیں شروع ہو گئیں، امی کے ساتھ بیکنگ بڑھ گئی۔ ان کی زندگی یکدم نہیں بدلی—بس ان کی سمت واضح ہو گئی۔

بلند حوصلے کیسے پیدا کریں؟

میں خود چار بچوں کی امّی ہوں۔ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو بڑے خواب دیکھنے اور بلند معیار پر پورا اترنے کی ترغیب دینے کے لیے کونسی بنیادی باتیں مددگار ثابت ہوتی ہیں یہ علم تو شاید ہے، لیکن اس کو عمل میں لانا میرا امتحان ہے! مجھے علم ہے کہ میری اولاد کو اپنے کردار کو کامیابی کا پیمانہ بنانا چاہیے — نمبروں، ظاہری شکل، یا لائکس کی بجائے دیانت داری، محنت، اور دوسروں کے لیے فائدہ مند ہونے کو معیار بنائیں۔ حقیقی، قابلِ رسائی رول ماڈلز متعارف کروائوں — یہ میرا کام ہے! دور کی مشہور شخصیات کی بجائے اپنے خاندان، یا شہر کی محنتی، باکردار مردوں اور خواتین کے قصے سناؤں، یہ میرا کام ہے۔ سوالات پوچھوں، لیکچر نہ دوں — "تمہیں اس میں کیا اچھا لگا؟"، "آج کسی کی مدد کی؟" جیسے سوالات بچوں کو خود سوچنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ ہنر اور مقصد پر توجہ دینے کی ترغیب دینا میرا کام ہے! ایسی سرگرمیاں جو بچے کو کچھ بنانا سکھائیں (امی کی کھیر اور کڑاہی گوشت کی ترکیب، کوڈنگ، تدریس، کوئی دستکاری) یہ مشغلے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو نمائش سے زیادہ تخلیق کی طرف لے جاتے ہیں۔

ناکامی کو معمول کے طور پر پیش کروں — اگر بچے یہ بات سمجھ جائیں کہ ہر بڑی شخصیت نے ناکامیوں سے گزر کر ہی کوئی مقام پایا ہے، تو وہ فوری، سطحی کامیابی کے پیچھے نہیں بھاگیں گے۔ ناکامیاں ہر کامیابی کا حصہ ہوتی ہیں۔

It takes a village to raise a child

یہ کہاوت جتنی وزنی ہے اس کا اندازہ اب جا کر ہوا۔ ذمہ داری صرف والدین کی نہیں ہوتی ہے۔ خاندان کے بڑے بزرگ، بڑے بھائی بہن جب اپنے گھر کے چھوٹوں کی تعلیم، خوابوں، اور رائے کو یکساں اہمیت دیتے ہیں، تو وہ ان کی خود اعتمادی میں وہ کچھ بھر دیتے ہیں جو کوئی سوشل میڈیا کی شخصیت نہیں دے سکتی۔ ایک والد کا یہ کہنا کہ "مجھے تم پر فخر ہے" کسی بھی آن لائن تعریف سے زیادہ وزن رکھتا ہے!

معاشرے کی ذمہ داری — اساتذہ، امام مسجد، خطیب، صحافی، اور کاروباری شخصیات — سب اپنی اپنی جگہ ایسی مثالیں پیش کر سکتے ہیں جو بلند اخلاقی معیار اور حقیقی کامیابی کو جوڑ کر دکھائیں۔ خطبات میں، سکول کی تقریبات میں، اور میڈیا میں ایسے مردوں اور خواتین کو نمایاں کیا جائے جنہوں نے علم، خدمت، یا کردار کے ذریعے نام بنایا، نہ کہ کسی لغو پوڈکاسٹ کے ذریعے۔ ہر ماں اور باپ، استاد اور استانی، بڑا بھائی اور بڑی بہن کو یہ یاد

رکھنا چاہیے کہ وہ خود ایک "انفلوئنسر" ہے، چاہے اس کے پاس کیمرہ ہو یا نہیں۔ اس کا صبر، اس کی گفتگو، اور اس کا کردار گھر کے چھوٹے بچوں پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔

سکرین سے ہٹ کر — کتاب، آواز، اور کلام کی طرف

اگر ہم چاہتے ہیں کہ نوجوانوں کی نظر چمک دار مگر کھوکھلی نمائش سے ہٹے، تو انہیں کہیں اور مصروف کرنا ہو گا — کسی ایسی چیز میں جو ذہن کو گہرائی دے، نہ کہ صرف وقت گزارے۔

اچھی کتابیں اس کا ایک آسان اور طاقتور ذریعہ ہیں۔ جب کوئی نوجوان سیرتِ صحابہؓ و صحابیاتؓ پڑھتا ہے، کسی عالم دین کی سادہ زبان میں لکھی کتاب پڑھتا ہے، یا کوئی ایسا ناول جو کردار اور بامعنی جدوجہد کی کہانی سناتا ہے، تو وہ آہستہ آہستہ ایک ایسا اندرونی معیار بنا لیتا ہے جس سے وہ خود ہی کھوکھلی چمک اور حقیقت میں فرق کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح ایسے پوڈکاسٹس اور آن لائن لیکچرز جو علم، تربیت، یا دینی سمجھ بوجھ پر مبنی ہوں، انہیں یہ سکھاتے ہیں کہ گفتگو صرف تفریح کے لیے نہیں بلکہ دنیا کے علوم پر سوال کرنے اور ان کو سمجھنے کے لیے ہونی چاہیے۔ ہفتے میں ایک بار خاندان مل کر کوئی اچھی کتاب کا حصہ پڑھے یا کسی معیاری پوڈکاسٹ کا اقتباس سنے اور اس پر بات کرے، تو یہ عادت رفتہ رفتہ بچوں کی ترجیحات بدل دیتی ہے۔

اور اس سب میں سب سے بلند مقام قرآن مجید کا ہے۔ قرآن صرف عبادات اور احکام کا مجموعہ نہیں — یہ ایک مکمل اخلاقی نقشہ ہے۔ ہمارے خالق نے اس میں سچائی، صبر، انصاف، حیا، دیانت داری، اور دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنے جیسی صفات بار بار، مختلف انداز میں، اور مختلف واقعات کے ذریعے ہماری رہنمائی کے لیے بتائیں ہیں۔ جب کوئی نوجوان قرآن کو سمجھ کر پڑھتا ہے، تو وہ صرف "دین" نہیں سیکھتا، وہ ایک بلند معیارِ کردار سیکھتا ہے۔ نبی کریم ﷺ، حضرت ابو بکرؓ، حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ، اور حضرت فاطمہؓ جیسی ہستیوں کی سیرت دراصل اسی قرآنی معیار کی زندہ مثالیں ہیں — یہی وجہ ہے کہ ان کا اثر صدیوں بعد بھی باقی ہے، جبکہ نمائشی شہرت چند مہینوں میں دھندلا جاتی ہے۔

اس ساری بحث کا نچوڑ ایک ہی نکتے پر پہنچتا ہے: بچہ جتنی دیر آن لائن کسی اجنبی چہرے کو دیکھتا ہے، اس سے کہیں زیادہ گہرا اثر وہ گھر میں روزانہ دیکھے جانے والے کردار سے لیتا ہے۔ کوئی بھی انفلوئنسر، کتاب، یا لیکچر اس خلا کو پورا نہیں کر سکتا جو والدین کی اپنی مثال چھوڑتی ہے۔

جب ایک ماں خود صبر سے بات کرتی ہے، جھوٹ سے بچتی ہے، اور اپنے بچوں کے ساتھ وقت گزارتی ہے، تو وہ بغیر کسی لیکچر کے سب سے مؤثر سبق دے رہی ہوتی ہے۔ جب ایک باپ اپنے بیٹے اور بیٹی سے یکساں طور پر ان کے خیالات پوچھتا ہے، انہیں سنتا ہے، اور خود اعلیٰ اخلاق پر قائم رہتا ہے، تو وہ انہیں وہ بھروسہ دیتا ہے جو وہ کہیں اور تلاش نہ کر سکیں۔ بچے وہ نہیں سیکھتے جو انہیں کہا جاتا ہے — وہ وہی سیکھتے ہیں جو وہ دیکھتے ہیں۔ اگر گھر میں دکھاوا، بے صبری، یا دوسروں کی برائی عام ہو، تو باہر کی نصیحتیں بے اثر رہ جاتی ہیں۔ اور اگر گھر میں سچائی، عاجزی، اور مقصدیت نظر آئے، تو باہر کی چمک دمک بچوں کو آسانی سے متاثر نہیں کر پاتی۔

یہی وہ اصل طاقت ہے جو والدین کے پاس ہے — اور شاید اکثر والدین کو خود اندازہ نہیں کہ وہ کتنی بڑی طاقت رکھتے ہیں۔ سوشل میڈیا کا مقابلہ کسی اور سکرین سے نہیں، بلکہ گھر کے اندر موجود ایک زندہ، مستقل، اور محبت بھرے کردار سے ہوتا ہے۔

بات مختصر یہ ہے

آج کے نوجوان کو یہ بتانا ضروری نہیں کہ سوشل میڈیا برا ہے — بلکہ یہ سکھانا ضروری ہے کہ حقیقی عزت، اثر، اور کامیابی کہاں سے آتی ہے۔ جب گھر میں حکمت کی آواز موجود ہو، جب مرد و عورت دونوں مل کر بلند معیار کی مثالیں پیش کریں، اور جب دینی و تاریخی رول ماڈلز زندہ رہیں، تو کوئی بھی چمکدار مگر کھوکھلی شخصیت اس بیٹے یا بیٹی کا راستہ نہیں بدل سکتی۔

زینب اور بلال کی نانی نے کوئی لمبی تقریر نہیں کی تھی — بس ایک ایک سوال پوچھا تھا۔ کبھی کبھار وقت پر پوچھا گیا، ایک سوال، پوری زندگی کی سمت بدل دیتا ہے۔





گفتگو: جاوید احمد غامدی
اخذ و ترتیب: حافظ غلام دستگیر

فنون لطیفہ: اسلام کی نظر میں

یہ مضمون جناب جاوید احمد صاحب غامدی کی گفتگو سے ماخوذ ہے۔
آپ بھی اس طرح کے مضامین مرتب کر سکتی ہیں

فنونِ لطیفہ سے پہلے مختصر طور پر یہ جاننا ضروری ہے کہ انسانی زندگی کے ساتھ اسلام کا تعلق درحقیقت ہے کیا؟ اس بات کو سمجھنا اس لحاظ سے لازم و ملزوم ہے کہ جب تک اس چیز کو اچھے طریقے سے سمجھ نہ لیا جائے اس وقت تک اسلام کی بہت سی باتیں سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔

عالم کے پروردگار نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ایک ایسی دنیا بنائے جو کہ ہمیشہ رہے، جو ابدی ہو، جس میں موت ہمیشہ موت کے حوالے کر دی جائے؛ جس میں ماضی کا نہ کوئی پچھتاوا ہو اور نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ ہو۔ اُس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے جنت الفردوس کا نام دیا۔ اور اس کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اپنی جنت کو آباد کرنے کے لیے استحقاق کی بنیاد پر لوگوں کا انتخاب کرے گا۔ چنانچہ یہ دنیا بنائی گئی اور اس میں انسان کو اس امتحان کے لیے بھیج دیا گیا کہ وہ اس دنیا میں جا کر کیا رویے اختیار کرتا ہے اور کس طرح اپنے آپ کو اللہ کی اُس ابدی بادشاہی میں داخل ہونے کے لیے تیار کرتا ہے۔

یہ بات بھی اللہ تعالیٰ نے پہلے مرحلے پر واضح کر دی کہ اُس ابدی بادشاہی میں داخل ہونے کے لیے ایک ہی مطالبہ ہے، اور وہ مطالبہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو کس درجہ پاکیزہ بنا کر اللہ کے حضور میں پہنچتا ہے۔

یہ پاکیزگی ہی ہے جسے قرآن مجید اپنی اصطلاح میں 'تزکیہ' سے تعبیر کرتا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ انسان کو خیر و شر کا شعور دے کر اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں یہ بات الہام کر دی ہے کہ کیا چیز اچھی ہے اور کیا چیز بری ہے۔ انسان کو خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا شعور پوری طرح عطا کیا گیا ہے۔ اور انسان کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ اپنے نفس کو آلودہ کرتا ہے یا اسے پاکیزہ بناتا ہے۔

قرآن مجید نے یہ بات واضح کی ہے کہ یہ شعور انسان کی فطرت میں بھی الہام کیا گیا ہے اور اس کے بعد نبوت کا سلسلہ بھی جاری کر دیا اور اپنے انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے بار بار اس کی یاد دہانی کا آخری باب قرآن مجید کی صورت میں رقم ہوا ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا آخری عہد نامہ ہے، جسے بالکل محفوظ کر کے انسانیت کو دے دیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے سے یہ بات ہر شخص پر واضح کی جاتی رہے کہ اللہ تعالیٰ کی اسکیم کیا ہے، وہ انسانوں سے کیا چاہتا ہے؟ اور پاکیزگی کے معاملے میں انسان کو جہاں خیر و شر میں کوئی خلجان پیش آئے تو وہاں اس کی رہنمائی کر دیتا ہے۔

اس مقصد کے لیے انسان کو دنیا میں بھیج کر اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت اُسے، یعنی انسان کو دی ہے اور جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا تھا کہ میں یہ ہدایت انسان کو دیتا رہوں گا، اُس کی تاریخ بھی بیان کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ انسان یہ ہدایت لے کر اس دنیا میں آیا تھا۔ انسان نے تاریکی میں زندگی شروع نہیں کی تھی۔ انسان کے ہاں اس ہدایت کے بارے میں اختلاف بھی نہیں تھا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد انسانوں کے مابین اختلافات نمودار ہونا شروع ہوئے اور یہ چیز سامنے آنا شروع ہوئی کہ انسان خیر و شر کے امتیاز میں خیر کے خیر ہونے اور شر کے شر ہونے کے بارے میں فیصلہ کرنے میں غلطی کر رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کا سلسلہ اُن کے لیے پے در پے جاری کر دیا تاکہ کسی موقع پر بھی انسان کو تردد نہ ہو۔ یہ ہدایت ہی اصل میں اسلام ہے۔ اگر اسلام کی دعوت کو ایک لفظ میں بیان کریں تو وہ ہے: پاکیزگی۔ یہ پاکیزگی پورے انسان سے مطلوب ہے۔ اب ہم انسان کا جائزہ لیتے ہیں کہ انسان کیا ہے؟

ہر انسان بنیادی طور پر تین وجود رکھتا ہے: ۱- حیوانی۔ ۲- عقلی۔ ۳- اخلاقی۔

حیوانی وجود

اسلام انسان سے اُس کے حیوانی وجود سے بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اسے بھی پاکیزہ بنا کر رکھے۔ یہ ہم دیکھ

ہیں کہ کتب حدیث اور کتب فقہ میں حیوانی وجود کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے بہت سے احکام دیے گئے ہیں۔ مثلاً رفع حاجت، جنابت اور طہارت وغیرہ کے لیے کیا چیزیں ملحوظ رکھنی ہیں، بڑی تفصیل کے ساتھ تمام انبیا نے اس کے احکام دیے ہیں۔

عقلی وجود

یہ بات کہ انسان کا عقلی وجود بھی پاکیزگی کا تقاضا کرتا ہے۔ جس آدمی کی نظر انسانی تاریخ پر ہے، وہ جانتا ہے کہ انسان جب خود سوچتا ہے تو وہ اوہام میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ انسانی عقل بڑی نعمت ہے، لیکن چراغ راہ ہے، منزل نہیں ہے۔ چنانچہ جب وہ چیزوں کے بارے میں فیصلے کرتی ہے تو غلطی کھا جاتی ہے اور غلطی کھانے کے اسباب بھی بڑی حد تک اُس میں موجود ہیں۔ عام طور پر وہ راستہ دیکھتی ہے، وہ راستہ دکھاتی ہے، لیکن غلطی وہ اُس وقت کھاتی ہے جب وہ اپنے جذبات اور تعصبات کے ہاتھوں کسی موقع پر اپنے آپ کو مغلوب کر بیٹھتی ہے۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ انسان کو متنبہ کیا جاتا رہے اور اس کو یہ بتایا جاتا رہے کہ انسان کو ان اوہام سے نجات پا کے کس مقام پر کھڑا ہونا ہے۔ ہم جب انسانیت کی تاریخ پڑھتے ہیں تو یہ جانتے ہیں کہ اُس نے علوم کے بارے میں کیا کیا غلطیاں کی ہیں اور پھر کس طرح انبیا نے اُنھیں متنبہ کیا ہے۔ یہ عقائد کے تزکیے کا باب ہے، جس میں انسان اپنی عقل کے ذریعے سے صحیح نتائج تک پہنچتا ہے۔

اخلاقی وجود

انسان کے اِس وجود سے بھی پاکیزگی مطلوب ہے۔ انسان کے اخلاقی وجود میں خیر اور شر کا ضروری علم تو انسان کو دے کر بھیج دیا گیا ہے، لیکن جہاں کوئی خرابی کا امکان ہے، وہاں انبیا نے اُس کو تعلیم دی ہے۔ اسی سے شریعت کا تصور پیدا ہوا۔ چونکہ انسان ہمیشہ یہ کرتا ہے کہ وہ اخلاقی تصورات کو قانون کی شکل دے دیتا ہے؛ کبھی اپنی انفرادی زندگی کے لیے، کبھی اپنی اجتماعی زندگی کے لیے۔ جب وہ اُسے قانون کی شکل دیتا ہے تو اپنے لیے بہت سے رسوم اختیار کرتا ہے، بہت سے معروفات کا پابند کر لیتا ہے اور پھر وہ سمجھتا ہے کہ یہ اُس کی تہذیب ہے، اُس کا تمدن ہے، اُسے اِس کے اندر جینا ہے۔ اجتماعی زندگی کے لیے اسی طرح قانون بناتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اُسے اپنے اوپر نافذ کرتا ہے، اُسے دوسروں پر بھی نافذ کرتا ہے۔ چونکہ انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُسے ایک قانون دیا۔ اس قانون کو مذہب کی اصطلاح میں 'شریعت' کہا

جاتا ہے۔ مذہب کے دو حصے ہیں: ایک حصے کو 'ایمانیات' اور دوسرے حصے کو 'الکتاب' کہا جاتا ہے۔ یہ اسلام اور انسان کا مختصر خلاصہ ہے۔ جو انسان کے ساتھ اُس کا تعلق ہے، اب اس تعلق کو سامنے رکھ کر فنون لطیفہ کی طرف آیئے۔

یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے اس طریقے سے بنائی ہے کہ اس میں انسان نہ صرف یہ کہ اپنے حیوانی وجود کے ساتھ کھاتا، پیتا اور جانوروں کی طرح اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے، بلکہ اُس میں جمالیات کی یہ حس اتنی غیر معمولی ہے کہ اس کا انسان کے انفرادی و اجتماعی پہلو پر اظہار دیکھتے ہیں۔

انسان خوب صورتی کو پسند کرتا ہے۔ یہ خوب صورتی وہ فطرت کے ہر ہر مظہر میں دیکھتا ہے۔ فطرت اپنی ذات میں بے حد خوب صورت ہے۔ اپنی خوب صورتی کو ہر ہر پہلو سے نمایاں کرتی ہے۔ پھر یہ خوب صورتی اشیا کے وجود میں بھی ہے؛ اُن کی صورت میں بھی ہے؛ اُن کی سیرت میں بھی ہے؛ اُن کی آواز میں بھی ہے؛ اُن کی تشکیل میں بھی ہے؛ اُن کے اظہار میں بھی ہے، الغرض کوئی ایک پہلو نہیں ہے جس میں خوب صورتی نمایاں نہ ہوتی ہو۔

اس خوب صورتی کا چشمہ خود ذات خداوندی سے پھوٹتا ہے۔ چنانچہ ایک مشہور روایت ہے:

''بے شک، اللہ خوب صورت ہے اور خوب صورتی کو پسند فرماتا ہے۔'' (مسلم، رقم ۲۷۵)

جمالیات کا یہ احساس جو انسان کے اندر ڈالا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ اُس فاطر فطرت نے انسان میں ڈالا ہے۔ انسان نے اس کو کسی دوسری جگہ سے اخذ نہیں کیا۔ پھر خود جب اللہ تعالیٰ اپنی فطرت کو بیان کرتے ہیں تو اس خوب صورتی کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

قرآن مجید کے بہت سے مقامات ہیں کہ جن میں اللہ تعالیٰ اپنی آیات کی نشان دہی کر رہے ہوتے ہیں تو بار بار اس جانب توجہ دلاتے ہیں کہ میں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ تمھارے لیے کھانے کا ایک ڈھیر پیدا کر دیا ہے اور تم گھاس پھوس کھا کر صرف اپنا پیٹ ہی نہیں بھرتے، بلکہ میں نے اس میں اتنا تنوع رکھا ہے، اتنی جدت پیدا کی ہے، اتنی بو قلمونی پیدا کی ہے، ایسے گوناگوں پہلوؤں سے تمھاری تسکین پیدا کی ہے کہ انسان اندازہ نہیں کر سکتا۔ ذائقے میں اُس نے کتنے تنوعات پیدا کیے ہیں۔ خود انسان کے وجود میں کتنے تنوعات رکھے ہیں۔ انسان کے لباس میں کتنے امکان موجود ہیں۔ اور تو اور خود فطرت کو اپنی آخری خوب صورتی میں بنا کر اُس خوب صورتی کو بڑھانے، اُس کی تہذیب کرنے، اُس کی ثقافت کو بلند ترین معیار تک پہنچانے کا ایسا غیر معمولی داعیہ انسان کے

اندر رکھا ہے کہ ہم نے کیا کچھ ایجاد کر ڈالا ہے۔ یعنی جب انسان اس دنیا میں بھیجا گیا ہو گا تو شاید کسی غار ہی میں بھیجا گیا ہو گا، لیکن انسان آج غار میں نہیں رہتا۔ اس کے برعکس، جانور آج بھی اُسی غار میں رہتے ہیں، لیکن انسان کا معاملہ یہ نہیں۔ انسان نے آگے بڑھ کر اپنے اُس جمالیاتی احساس کو فطرت کے ساتھ متعلق کیا ہے اور جب فطرت کے ساتھ متعلق کیا ہے تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مکانوں میں خوب صورتی آئی ہے، دیواروں میں خوب صورتی آئی ہے، پردوں میں، اٹھنے میں، بیٹھنے اور کھانے پینے، الغرض جمالیاتی حس کا اظہار انسان کے ایک ایک پہلو سے ہونا شروع ہو گیا ہے۔ جس چیز کو قرآن مجید اپنی اصطلاح میں 'زینت' سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے بعد دیکھیے، فنون لطیفہ کی نوعیت کیا ہے؟

فنون لطیفہ کچھ نہیں ہے، مگر یہ کہ انسان کی شدت احساس کا جمالیاتی اظہار ہے، یعنی فنون لطیفہ کی تعریف کچھ خاص تو نہیں ہے، لیکن انسان کے اندر جب کوئی چیز شعور اور لاشعور میں اترتی ہے تو وہ احساس کی شدت پیدا کرتی ہے۔ یہ احساس کی شدت غم سے بھی ہوتی ہے، خوشی سے بھی ہوتی ہے، مسرت سے بھی ہوتی ہے، یہ اشتعال سے بھی ہوتی ہے، غصے سے بھی ہوتی ہے۔ یہ جو احساس کی شدت ہے، یہ خواہ غصے کی ہو، خواہ فرحت کی ہو، جب آپ اسے جمالیاتی لبادہ پہنا دیتے ہیں تو یہ فنون لطیفہ ہے۔ یہ جمالیاتی لبادہ کبھی تصویر کی شکل میں پہناتے ہیں، کبھی عمارت کی شکل میں، کبھی آواز کی صورت میں، کبھی شاعری کی صورت میں، کبھی لباس کی صورت میں اور کبھی موسیقی کی صورت میں پہناتے ہیں۔ یہ سب باتیں انسان کے اندر ودیعت کر دی گئی ہیں اور انسان یہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کر رکھا ہے، اُس کے مفرد اجزا میں ترکیب دینا شروع کر دیتا ہے۔ یہ ترکیب ہی نیا سے نیا حسن پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ تاج محل میں جو اینٹ مسالا لگا ہوا ہے، دنیا میں کئی جگہوں پر پایا جاتا ہو گا۔ اگر کوئی شخص چاہے تو اُس کا ایک ڈھیر فراہم کر کے دے سکتا ہے، لیکن وہ کیا چیز ہے کہ جس نے اُسی اینٹ مسالے کو تاج محل بنا دیا ہے۔ وہ انسان کے اُس جمالیاتی احساس کی ترکیب ہے جو اُسی اینٹ گارے کے ساتھ متعلق ہو گئی ہے۔ تاج محل پر اگر تھوڑا غور کیا جائے تو یہ بات معلوم ہو گی کہ اُسی اینٹ پتھر نے اٹھ کر انسان کے ذہن میں جگہ بنائی ہے، پھر دماغ میں وہ خاص عمل سے گزرا ہے، پھر انسان کی جمالیاتی حس نے اُس کو تراشنا شروع کیا ہے۔ جب وہ دماغ میں تراشا گیا ہے، پھر اُس کو زمین پر منتقل کرنے کا کام کیا گیا ہے، پھر انسان اُسے دیکھتا ہے اور خود ہی کہتا ہے کہ:

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

(بشکریہ ماہنامہ اشراق لاہور)



افسانہ



نعیم احمد بلوچ

تین دیویاں

یہ بات نہیں تھی وہ تینوں پچاس برس بعد مل رہی تھیں۔ وہ ملتی تھی لیکن ایسے جیسے ائیر پورٹ پر مختلف سمتوں میں جانے والے مسافر۔ لیکن ایک وعدہ ضرور کرتی تھیں؛ کبھی شائستہ، شازیہ سے تو کبھی نائلہ، شائستہ سے تو کبھی شازیہ، نائلہ سے۔۔۔ مگر یوں لگتا کہ وہ ہیں تو ایک دوسرے کے قریب ہی لیکن ریلوے کی متوازی دوڑتی پٹریوں کی طرح، جو بنی ہی ایک دوسرے سے نہ ملنے کے لیے تھیں۔



مگر اب پچاس برس بعد زندگی نے انھیں ایک جنکشن پر پہنچا دیا تھا۔۔یہ تھا ریٹائرمنٹ کا جنکشن۔شائستہ نے ہی ایک منصوبہ بنایا تھا۔اس مشہور پارک کی کنٹین کا جو، ان کے کالج کے قریب تھی اور جس کی 'کافی' ان سب کی پسندیدہ تھی۔'کیفے بریک' کے اسی میز پر، جو وہاں ایک پرانے برگد کے درخت کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔جو درخت کا حصہ بھی تھا اور اس سے آزاد بھی۔اسے قوس قزح کے سارے رنگوں سے مزین کیا گیا تھا اور اس رنگوں کی تازگی اسی لیے تھی ہر دفعہ انھیں تازہ کر دیا جاتا تھا۔

کالج کے زمانے میں تین دیویاں کہلانے والی آج اسی جگہ اکٹھی ہو رہی تھیں۔وجہ حسن ہی نہیں تھا؛ اگرچہ تینوں خوب صورت تھیں مگر وجہ یہ تھی کہ وہ ہمیشہ اکٹھی دکھائی دیتی تھیں۔ایک ہی بنچ، ایک ہی کینٹین، ایک ہی رکشا مگر مستقبل کے بارے میں تین بالکل مختلف خواب۔پھر زندگی آئی اور تینوں کو تین مختلف سمتوں میں لے گئی۔

اب وہ ستر کے پیٹے میں تھیں۔

شائستہ میزبان تھی اس لیے سب سے پہلے آئی تھی۔اسی نشست پر بیٹھی جو اس کی پسندیدہ تھی۔اس کے قریب کوئی سہارا نہ تھی۔کسی کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کسی لاٹھی سے چلتی ہے یا نہیں۔وہ بس بیٹھی نائلہ کو دیکھ رہی تھی، جو شازیہ سے پہلے پہنچ گئی تھی۔اس نے اپنی چھڑی میز کے ساتھ ٹکائی۔وہ ابھی بیٹھی ہی تھی کی شازیہ بھی آن پہنچی۔حیرت انگیز طور پر وہ کسی مہنگی گاڑی پر نہیں، ایک رکشے پر آئی تھی۔

تینوں نے ایک دوسرے کا مسکراتی مگر متجسس نگاہوں سے جائزہ لیا۔علیک سلیک کے بعد شازیہ نے اچانک پوچھا:

"ہم تینوں میں سب سے زیادہ خوش قسمت کون نکلی؟"

نائلہ ہنس پڑی۔

"اس عمر میں بھی مقابلہ ختم نہیں ہوا؟"

مقابلہ نہیں۔"شازیہ نے کہا، "حساب۔""

شائستہ مسکرائی:

"حساب ہمیشہ آخر میں کیوں یاد آتا ہے؟"

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد تینوں نے فیصلہ کیا کہ آج وہ ایک دوسرے کو اپنی وہ زندگی سنائیں گی جو تصویروں، شادی کے کارڈوں، اخباری خبروں، فیس بک اور خاندانی تقریبات میں کبھی دکھائی نہیں دی۔

"کوئی جلدی نہیں۔ آج خوب باتیں کرنی ہیں"

"ہاں ٹھیک کہتی ہو، کوئی جلدی نہیں، کم از کم میرا تو کوئی انتظار نہیں کر رہا۔۔ چلو نائلہ ہو جاؤ شروع۔"

اور وہ ہمیشہ سے 'اچھی بچی' رہی تھی۔ بس مان لی بات اور جو کچھ کہا؛ اس کا خلاصہ تھا:

شادی اکیس برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ رشتہ بہت اچھا تھا۔ لڑکا پڑھا لکھا تھا، کاروبار تھا، بڑا گھر تھا، گاڑی تھی اور خاندان شہر کے معزز خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ رخصتی کے وقت اس کے والد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ بیٹا، اب وہی تمہارا گھر ہے۔ شوہر کو خوش رکھنا۔ کبھی ہماری عزت پر حرف نہ آنے دینا۔"

نائلہ نے پوری زندگی اس نصیحت کی لاج رکھی۔ اس نے شوہر کی پسند کے کپڑے پہنے، اس کی پسند کے لوگوں سے ملی، جن لوگوں کو وہ ناپسند کرتا تھا ان سے تعلق ختم کیا۔ اسے انگریزی ادب پڑھنے کا شوق تھا لیکن شادی کے بعد سب ختم۔ خواب کتاب میں رکھے پھول کی طرح خشک ہو گئے۔

کتابوں کی الماری میں ڈیکوریشن پیس کی طرح رکھا ڈکنز کا سب سے پسندیدہ ناول 'Great Expectations' کھولتی اور اس خشک پھول کی خوشبو سونگھنے کی کوشش کرتی جو اب بالکل ہی مسحجر ہو چکا تھا۔ شوہر نے کہا، ''تمہیں نوکری تھوڑی کرنی ہے۔ نیک پروین نے باپ کی لاج رکھ لی۔ پھر بچے آ گئے۔ بچوں کے سکول، شوہر کا کاروبار، ساس کی بیماری، بیٹیوں کی شادیاں، بیٹے کا بیرون ملک جانا؛ زندگی گزرتی گئی۔ وہ واقعی بہت اچھی بیٹی تھی۔ بہت اچھی بیوی۔ بہت اچھی بہو۔ بہت اچھی ماں۔ شوہر کی وفات ہوئی تو بیٹے نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ بہو اس کا احترام کرتی تھی، پوتے اس سے محبت کرتے تھے۔ اس کے پاس اپنا کمرہ تھا، علاج کی سہولت تھی، ڈرائیور تھا، ملازمہ تھی۔

"تو پھر مسئلہ کیا ہے؟" شازیہ نے پوچھا۔

نائلہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر بولی:

"کوئی مسئلہ نہیں۔ بس کبھی کبھی سوچتی ہوں، نائلہ کون تھی؟"

دونوں نے اسے دیکھا۔

"بیٹی معلوم ہے کس کی تھی۔ بیوی معلوم ہے کس کی تھی۔ ماں معلوم ہے کن کی ہوں۔ دادی بھی معلوم ہے کن کی ہوں۔ بس یہ نہیں معلوم کہ نائلہ کون تھی۔"

اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔

"میری زندگی میں سب کچھ میرا تھا۔ صرف زندگی میری نہیں تھی۔ میں اگر ہاری نہیں ہوں مگر جیتی بھی تو نہیں ہوں۔"

نائلہ خاموش ہوئی تو شازیہ نے سگریٹ نکالا۔ نائلہ نے حیرت سے دیکھا۔

"ابھی تک؟"

"اب وڈاکٹر نے بھی منع کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

تینوں ہنس پڑیں۔

شازیہ ان تینوں میں سب سے خوب صورت تھی۔ کالج کے زمانے ہی میں اسے ماڈلنگ کی پیش کش ہوئی تھی۔ گھر والوں نے سخت مخالفت کی۔ وہ گھر چھوڑ کر کراچی چلی گئی۔ پھر اس کی تصویریں رسالوں میں آئیں۔ پھر اشتہار۔ پھر ڈرامے۔ پھر فلمیں۔ پھر دبئی، لندن، پیرس۔ جس لڑکی کو اس کے والد نے کہا تھا کہ ''آج کے بعد ہمارا تم سے کوئی تعلق نہیں''، اسی لڑکی کے انٹرویو لاکھوں لوگ دیکھتے تھے۔ اس نے پیسہ کمایا۔ بہت پیسہ۔ محبتیں بھی کیں۔ شادی بھی کی، طلاق بھی ہوئی۔ ایک بیٹی ہوئی جو باپ کے ساتھ کینیڈا چلی گئی۔

"مجھے کسی مرد نے کبھی حکم نہیں دیا کہ میں کیا پہنوں، کہاں جاؤں، کس سے ملوں۔" شازیہ نے کہا۔

نائلہ نے آہستہ سے پوچھا: "پھر تم آزاد تھیں؟"

شازیہ نے سگریٹ بجھا دیا۔

"یہی تو میں پچاس سال سمجھتی رہی۔"

وہ اٹھ کر کیفے کی دیوار پر لگی اپنی جوانی کی ایک تصویر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"پھر ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ میرے مالک بدل گئے تھے۔ پہلے ابو طے کرنا چاہتے تھے میں کیسی دکھائی دوں، پھر مارکیٹ طے کرنے لگی۔ پہلے گھر کہتا تھا یہ مت پہنو، پھر کیمرہ کہتا تھا یہ پہنو۔ پہلے ایک مرد کی مرضی تھی، پھر لاکھوں مردوں کی نگاہ۔"

وہ تصویر کو دیکھتی رہی۔ کیفے کا ایک بوڑھا ملازم اس کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"فرق صرف یہ تھا کہ دوسری غلامی کی تنخواہ بہت اچھی تھی۔"

شائستہ نے پہلی بار مڑ کر اسے دیکھا۔ شازیہ مسکرائی:

"لیکن میری کہانی کو اتنا آسان بھی مت سمجھنا۔ میں نے دنیا دیکھی۔ میں نے کمائی کی۔ میں نے بہت سے فیصلے خود کیے۔ میں نے ایسے دروازے توڑے جن میں عورتوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ مجھے اپنی زندگی کے بہت سے حصوں پر فخر بھی ہے۔"

پھر اس کی آواز مدھم ہو گئی۔

"بس غلطی یہ ہوئی کہ میں نے اپنی قیمت اور اپنی قدر کو ایک ہی چیز سمجھ لیا۔ قیمت بازار طے کرتا رہا۔ قدر مجھے خود طے کرنی چاہیے تھی۔۔۔۔۔ بس اب گھر میں میرا انتظار کرنے والا کوئی نہیں۔ کوئی بھاگ کر میری گاڑی کا دروازہ کھولنے والا نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں اب وہ سکہ ہوں جو نئے سے بدل گیا ہے۔"

وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی اور ذرا تلخ سے لہجے میں بولی: "ابھی جب میں رکشے سے اتری تو ایک گزرنے والے نے پتا ہے کیا کہا؟ دونوں نے کچھ نہ پوچھا مگر وہ بولی: "کھنڈر بتا رہے ہیں کہ عمارت حسین تھی!"

فضا پر ایک لمحے کے لیے اداسی چھا گئی۔ مگر انھوں نے کافی کے کپوں میں اٹھتی ہوئی بھاپ میں پناہ لی۔

اب دونوں کی نظریں شائستہ پر تھیں۔

"اب محترمہ میزبان اپنی داستان سنائیں۔" شازیہ نے تلخی کو اپنی مصنوعی ہنسی سے دور کرتے ہوئے کہا۔

شائستہ بھی ہنس دی۔

تم دونوں کو کس نے بتایا کہ 'شائستہ' ہونا آسان تھا؟"

شائستہ نے شادی سے انکار نہیں کیا تھا۔ اس نے صرف اس 'پھپھو کے بیٹے' سے شادی سے انکار کیا تھا جسے اس کے والد نے منتخب کیا تھا۔ گھر میں قیامت آ گئی۔ دو سال تک والد نے اس سے بات نہیں کی۔ اس نے یونیورسٹی میں پڑھایا۔ پی ایچ ڈی کی۔ اپنی پسند کے آدمی سے شادی کی۔ ابو ہتھیار ڈال چکے تھے۔ دونوں نے طے کیا کہ گھر دونوں کا ہو گا، آمدنی دونوں کی، بچے دونوں کے اور خواب بھی دونوں کے۔ لیکن زندگی معاہدوں کے مطابق کہاں چلتی ہے؟ پہلا بچہ ہوا تو شائستہ کا تحقیقی کام دو سال پیچھے چلا گیا۔ شوہر کا کیریئر آگے بڑھتا رہا۔ دوسرے بچے کے بعد اسے بیرون ملک فیلوشپ ملی۔ اس مرتبہ شوہر نے کہا:

"میں بچوں کو سنبھال لیتا ہوں۔ تم جاؤ۔"

لوگ ہنسے۔ شوہر کے دوستوں نے اسے ''زن مرید'' کہا۔ شائستہ کے رشتہ داروں نے اسے ''خود غرض ماں'' کہا۔ وہ گئی۔ واپس آئی۔ پروفیسر بنی۔ بچوں کی پرورش بھی ہوئی۔ شادی میں جھگڑے بھی ہوئے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب دونوں نے علیحدگی کے بارے میں سوچا۔

"پھر؟"

"نائلہ نے پوچھا۔"

"پھر ہم نے فیصلہ کیا کہ شادی بچانی ہے تو دونوں کو بدلنا ہو گا۔ صرف مجھے نہیں۔"

"اور اب؟"

"وہ اپنے گھر سو رہا ہے۔"

دونوں چونکیں۔

"گھر اس کا ہے؟"

شائستہ ہنس پڑی۔ "نہیں۔ ہمارا گھر ہے۔"

مغرب ہو چکی تھی۔ تینوں خاموش بیٹھیں تو یوں لگا جیسے برگد کے اس پیڑ تلے تین عورتیں نہیں، تین زمانے بیٹھے ہیں۔

نائلہ نے اچانک شائستہ سے پوچھا:

"اگر تمہیں دوبارہ زندگی ملے تو یہی زندگی چنو گی؟"

شائستہ نے جواب دینے سے پہلے دونوں کو دیکھا۔

"ضروری نہیں۔""

دونوں چونک گئیں۔

"بہت سی غلطیاں درست کروں گی۔ بہت سے فیصلے بدلوں گی۔ حالات اس سے بھی بہتر رکھنے کی کوشش کروں گی۔"

شائستہ کے لہجے میں نہ فتح کا احساس تھا، نہ پچھتاوے کا۔ جیسے کوئی عمر بھر کا حساب سامنے رکھ کر صرف اتنا کہہ رہا ہو کہ نفع بھی میرا تھا اور نقصان بھی۔

نائلہ نے اپنی چھڑی کی طرف ہاتھ بڑھایا، پھر جیسے کچھ یاد آیا۔

"تم نے بتایا تھا نا تمھارا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں؟"

"ہاں، دس منٹ بھی نہیں لگتے۔"

"اور تم کہتی تھیں بہت خوب صورت بنایا ہے۔ باغ بھی ہے؟"

"باغ کیا ہے، ان کی سلطنت ہے۔" شائستہ ہنسی۔

"آدھی زندگی پودوں سے باتیں کرتے گزارتا ہے۔ چلو، آج دیکھ لو۔ کھانا بھی ہمارے ساتھ لیں گے۔"

"میں تو ضرور دیکھوں گی۔"

نائلہ نے چھڑی اٹھائی ہی تھی کہ اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے سکرین دیکھی۔ چہرے پر ایک لمحے کے لیے کچھ آیا اور گزر گیا۔

"ہاں بیٹا۔۔۔"

دوسری طرف آواز شاید بلند تھی۔ اتنی کہ شائستہ اور شازیہ دونوں تک پہنچ رہی تھی۔

"امی، آپ ابھی تک وہیں ہیں؟"

"بس بیٹا، نکل ہی رہی ہوں۔"

"آپ نے کہا تھا سات بجے تک آجائیں گی۔ ساڑھے آٹھ ہونے والے ہیں۔ سب انتظار کر رہے ہیں۔ ڈرائیور بھی کب سے باہر کھڑا ہے۔ آپ کو پتا ہے نا اتنی دیر باہر رہنا آپ کے لیے ٹھیک نہیں۔ فوراً گھر آئیں۔"

"ہاں، ہاں۔۔۔ بس پانچ منٹ۔۔۔"

"پانچ منٹ نہیں امی، پلیز ابھی۔"

فون بند ہو گیا۔ نائلہ نے فون پرس میں رکھا اور دونوں کی طرف دیکھا۔ اسے شاید اندازہ نہیں ہوا تھا کہ خاموش شام میں دوسری طرف کی آواز صرف اس نے نہیں سنی۔

"اصل میں۔۔۔ اس نے چھڑی سنبھالتے ہوئے کہا، ''مجھے یاد ہی نہیں رہا، دوا کا وقت ہو گیا ہے''۔ اور۔۔۔ بہو کی طبیعت بھی کچھ خراب تھی۔ پھر کبھی تمھارا گھر دیکھوں گی۔"

شائستہ نے صرف اتنا کہا:

"ضرور۔"

شازیہ خاموش رہی۔ چند منٹ پہلے نائلہ کہہ رہی تھی:

میری زندگی میں سب کچھ میرا تھا، صرف زندگی میری نہیں تھی۔

شائستہ کو اچانک محسوس ہوا، بعض جملے انسان اپنی زندگی کے بارے میں نہیں کہتا، اپنی تقدیر کے بارے میں کہتا ہے۔

نائلہ نے دونوں کو گلے لگایا اور آہستہ آہستہ پارک کے دروازے کی طرف چل دی۔

شازیہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر بولی:

''میں چلتی ہوں تمھارے ساتھ۔''

شازیہ کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی۔

"دیکھوں تو سہی عبداللہ صاحب کی سلطنت۔"

شائستہ کا ہاتھ میز پر رک گیا۔ وہ اس کے شوہر کا نام بغیر اس کے بتائے لے رہی تھی۔

"تم عبداللہ کو جانتی ہو؟"

ایک لمحے کے لیے دونوں کی نظریں ملیں۔ شازیہ نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور اسے بجھا دیا۔

"نام سنا ہے۔"

"کس سے؟"

"دنیا بہت چھوٹی ہے شائستہ۔"

شائستہ اسے دیکھتی رہی۔ ابھی چند لمحے پہلے تک اسے محسوس ہو رہا تھا کہ آج تینوں نے اپنی اپنی زندگی کی کتاب ایک دوسرے کے سامنے کھول دی ہے۔ اچانک اسے لگا، شازیہ نے اپنی کتاب کے کچھ صفحے بند رکھے تھے۔

"نہیں، آج نہیں۔ نائلہ کے ساتھ دعوت کروں گی تمھاری۔"

اس کا لہجہ پہلی مرتبہ سپاٹ تھا۔ شازیہ نے اس کی طرف دیکھا۔ شاید کچھ سمجھ گئی۔ اس ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی:

"ٹھیک ہے۔ مجھے انتظار رہے گا۔"

وہ اٹھی، پرس کندھے پر ڈالا اور چل دی۔

شائستہ برگد کی اس رنگین میز کے پاس کچھ دیر اکیلی بیٹھی رہی۔ قوسِ قزح کے رنگ اب مصنوعی روشنی میں پہلے سے زیادہ شوخ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بھی اٹھ گئی۔

عبداللہ باغ میں تھا۔ شائستہ نے گیٹ کھولا تو وہ گلاب کی ایک کیاری کے پاس جھکا ہوا تھا۔ آہٹ سن کر سیدھا ہوا۔

"ہو گئی ملاقات تین دیویوں کی؟"

شائستہ چونکی۔

"تمھیں یہ نام بھی یاد ہے؟"

"تم نے پچاس مرتبہ بتایا ہو گا۔" وہ مسکرایا۔ "کیسی ہیں نائلہ اور شازیہ؟"

شائستہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"شازیہ کو جانتے ہو؟"

عبداللہ کے ہاتھ میں پکڑی قینچی رک گئی۔ بس ایک لمحے کے لیے۔ پھر اس نے قینچی میز پر رکھ دی۔

"ہاں۔"

"کتنا؟"

عبداللہ نے کرسی کھینچی۔ "یہ سوال آج اچانک؟"

"اس نے تمھارا نام لیا۔"

عبداللہ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر ہنس دیا، مگر اس ہنسی میں شائستہ کو پہلی مرتبہ جھجک محسوس ہوئی۔

"ایک زمانہ تھا۔۔۔ تم سے شادی سے بہت پہلے۔۔۔ میں شازیہ کا دیوانہ تھا۔"

شائستہ خاموش رہی۔ پھر بولی:

"بہت؟"

"شاید اتنا جتنا اس عمر میں آدمی کسی تصویر، کسی آواز، کسی تصور کا دیوانہ ہو سکتا ہے۔"

"اور وہ؟"

عبداللہ نے شائستہ کی طرف دیکھا۔

"یہی مسئلہ تھا۔ مجھے ایک دن معلوم ہوا کہ میں اکیلا دیوانہ نہیں ہوں۔ اس کے بہت سے دیوانے تھے۔ کچھ

اس کی زندگی میں تھے، کچھ اس کے گرد۔ مجھے لگا میں اس زندگی کے ساتھ نہیں چل سکوں گا۔"

شائستہ نے آہستہ سے پوچھا:

"پھر تم نے مجھ سے شادی کر لی؟"

"میں نے تم سے شادی اس لیے کی کہ مجھے لگا کہ۔۔۔۔۔اس سے نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا ہو گا، نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔"

شائستہ اسے دیکھتی رہی۔ اور مسکراتے ہوئے زیر لب اس کے الفاظ دہرائے:

"نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا، نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ"



سفر نامہ



پروفیسر نسرین جاوید خان

منزلوں کے بیچ، خود سے ملاقات

سفر نامے اس حوالے سے بہت باعث کشش ہوتے ہیں یہ مقامات
کے ساتھ ساتھ مصنف کا بھی بہت اچھا تعارف کرا دیتے ہیں۔ یہ
تصحیح کو ایک "مصنف" بننے کا بھی نادر موقع دیتے ہیں۔ قارئین
صالحات کے لیے خصوصی دعوت ہے!

پندرہ مارچ کو بریڈفورڈ سے روانہ ہوئی تو خیال تھا کہ اب اگلا پڑاؤ دبئی ہو گا۔ وہاں کچھ وقت گزاروں گی اور پھر عمرے کے لیے جاؤں گی۔ منصوبہ کافی عرصے سے ذہن میں تھا، لیکن اس سفر کا آغاز ہی کچھ ایسا ہوا کہ میری سوچی ہوئی ترتیب بدل گئی۔ آج تقریباً چھ ماہ بعد واپس آ کر دیکھتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس سفر میں شہروں کے ساتھ ساتھ اپنے اندر کی ایک دنیا سے بھی متعارف ہوئی ہوں۔

دبئی جانے والی ہماری پرواز الیگزینڈریا تک پہنچ کر واپس لوٹ آئی۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ایران کی جنگ کے دوران دبئی کے ہوائی اڈے پر حملے کے باعث پرواز آگے نہیں جا سکتی۔ پندرہ مارچ کو گھر سے نکلی تھی اور سولہ مارچ کو پھر گھر میں تھی۔ جس منزل کی طرف روانہ ہوئی تھی، وہاں پہنچنے کے بجائے نقطۂ آغاز پر واپس آ گئی تھی۔

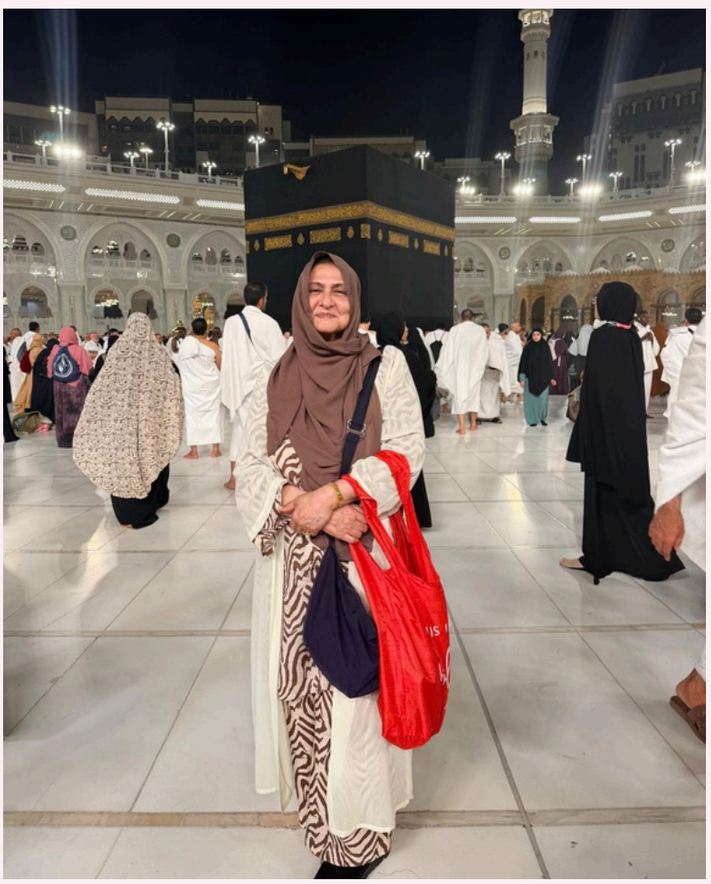
اس واپسی کے ساتھ ایک عملی پریشانی بھی تھی۔ برطانیہ میں میرے قیام کی اجازت ختم ہونے کو تھی اور مجھے

اٹھارہ مارچ سے پہلے روانہ ہونا تھا۔ دو سالہ ویزے کے دوران امریکہ اور دبئی آنا جانا رہا تھا، لیکن اب مزید ٹھہرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ فوراً نیا فیصلہ کرنا ضروری تھا۔

تب وہ ارادہ، جسے میں نے دبئی پہنچنے کے بعد کے لیے رکھا ہوا تھا، سامنے آ گیا: کیوں نہ اب سیدھا عمرے کے لیے چلی جاؤں؟

اسی روز فیصلہ ہوا اور سترہ مارچ کو میں جدہ کی پرواز میں تھی۔

بظاہر یہ سفری منصوبے کی تبدیلی تھی، مگر میرے لیے اس کا ایک بہت ذاتی اور روحانی مفہوم تھا۔ میں دبئی کے لیے نکلی تھی، جہاز واپس آ گیا اور پھر راستہ حرم کی طرف کھل گیا۔ میرے دل نے اسے یوں محسوس کیا کہ اللہ نے مجھے موڑ کر اپنے پاس بلا لیا ہے۔





مکہ پہنچی تو رمضان کے آخری تین روزے باقی تھے۔ وہیں روزے پورے کیے، عمرہ ادا کیا اور حرم میں وقت گزارا۔ اس حاضری کا سکون میرے لیے بہت گہرا تھا۔ چند ہی روز پہلے پرواز کی واپسی اور بروقت برطانیہ سے

نکلنے کی فکر تھی، اور اب میں اللہ کے گھر میں تھی۔ حالات نے اچانک رخ بدلا تھا اور میں ایک ایسے تجربے سے گزر رہی تھی جس کی خواہش تو تھی، مگر جس کی یہ صورت میرے گمان میں نہیں تھی۔

وہاں سے مدینہ گئی تو بیمار ہو گئی۔ جتنا عرصہ مدینے میں رہی، طبیعت خراب ہی رہی۔ اکیلی بھی تھی۔ بیماری میں انسان کو کسی اپنے کی موجودگی، کسی کے پوچھ لینے اور دیکھ بھال کرنے کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ میرے لیے بھی یہ آسان وقت نہیں تھا۔ تاہم، اسی کیفیت میں مجھے اللہ کے ساتھ ہونے کا جو احساس ملا، اسے پوری طرح لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے آج بھی مشکل ہے۔

طبیعت کی خرابی کے باوجود اللہ نے ریاض الجنہ میں حاضری کی توفیق دی، نفل پڑھ لیے اور اپنے حصے کے وہ لمحے سمیٹ لیے جو اب میری زندگی کی قیمتی یادوں میں شامل ہیں۔ بیماری اپنی جگہ موجود تھی، مگر اس کے درمیان ایک گہرا سہارا بھی محسوس ہوتا رہا۔ میں بالکل اکیلی تھی، لیکن مجھے ہر ہر لمحے خدا کے ہونے کا احساس اپنے ساتھ رہا۔ اسی قیام میں میرے اندر ایک یقین پیدا ہوا:

میں اکیلی ہو کے بھی تنہا کبھی نہیں ہوں گی۔ یہ میرے لیے محض ایک تسلی کا جملہ نہیں تھا۔ میں اس کیفیت سے گزری تھی۔ جسم کی کمزوری اور ظاہری تنہائی کے درمیان قربت کا ایک ایسا تجربہ ہوا جس نے اپنے آپ کو اور اپنی زندگی کو دیکھنے کے میرے انداز پر گہرا اثر ڈالا۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں، اگر سب کچھ میرے بنائے ہوئے منصوبے کے مطابق ہوتا تو کیا میں اس احساس سے اسی طرح آشنا ہو پاتی؟

یکم اپریل کو شارجہ پہنچی تو میرے کزن شیراز اور ان کے بیٹے عمر مجھے لینے آئے ہوئے تھے۔ شیراز بہت اچھے انسان ہیں۔ اجنبی راستوں اور بیماری کے دنوں کے بعد اپنے لوگوں کا استقبال اچھا لگا۔ وہاں سے دبئی پہنچی، جہاں ہوٹل میں میری بکنگ ہو چکی تھی اور میری بیٹی شانزے نے مجھے ریسیو کیا۔ یوں اس غیر معمولی آغاز کے بعد سفر ایک نئی روزمرہ زندگی میں داخل ہوا۔

دبئی میں تقریباً پانچ ماہ گزرے۔ اس عرصے میں بیٹی کے ساتھ وقت بھی تھا، پرانے دوستوں سے ملاقاتیں بھی، ایک نئی دوستی بھی، اور اپنے ساتھ رہنے کا ایک نیا تجربہ بھی۔ اکیلے رہنے اور اپنی رفاقت سے لطف اٹھانے میں ایک فاصلہ ہوتا ہے۔ دبئی میں مجھے اس فاصلے کو طے کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اپنے ساتھ وقت گزارنا سیکھا اور یہ جانا کہ میری اپنی کمپنی بھی ایسی نہیں کہ میں اسے پسند نہ کر سکوں! یہ دریافت میرے لیے خوش گوار تھی۔ اپنے ساتھ رہنا آہستہ آہستہ ایک ایسا وقت بن گیا جس سے میں لطف اٹھانے لگی۔ اپنی کیفیت کو سمجھنے، اپنے

خیالات سننے اور اپنی زندگی پر غور کرنے کی گنجائش ملی۔

اسی دوران ایک دوستی ایسی ہوئی جس کی ابتدا صرف ایک مسکراہٹ سے ہوئی تھی۔ میں اور شانزے ایک ریستوران میں کھانا کھا رہے تھے۔ برابر کی میز پر ایک خاتون اکیلی بیٹھی تھیں۔ ان کی پشت میری طرف تھی، جبکہ شانزے انہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا، ''ماما، ساتھ والی میز پر جو خاتون بیٹھی ہیں، مجھے آپ کی کوئی رشتہ دار سی لگ رہی ہیں۔''

شاید ان کے خدوخال میں اسے کشمیریوں جیسی مشابہت محسوس ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد شانزے باہر سے کچھ لینے گئی تو میں نے نشست بدل لی۔ اب میری نظر ان خاتون پر پڑی۔ واقعی ان میں اپنی کزنز سے کچھ مشابہت دکھائی دی۔ انہوں نے میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور میں بھی مسکرا دی۔ میں کھانا کھا چکی تھی، اس لیے اٹھ کر ان کے پاس چلی گئی۔

یہ ممتاز صاحبہ تھیں۔ ان کا تعلق میمن خاندان سے ہے، بمبئی میں پلی بڑھی ہیں اور نیروبی میں آباد ہیں۔ بہت نفیس خاتون ہیں۔ اس مختصر تعارف سے بات آگے بڑھی، پھر ملاقاتیں ہوئیں، ساتھ وقت گزرا اور ایک پیاری سی دوستی بن گئی۔ آج بھی ہم فون پر رابطے میں ہیں۔

اس ملاقات کی یاد مجھے اس لیے بھی عزیز ہے کہ اس میں کسی بڑی کوشش یا پیش بندی کا دخل نہیں تھا۔ بیٹی کا ایک مشاہدہ، نشست کی تبدیلی، ایک مسکراہٹ اور بات کرنے کے لیے آگے بڑھنا—بس اتنی سی بات سے زندگی میں ایک نیا تعلق شامل ہو گیا۔ سفر کی یہ بھی خوب صورتی ہے کہ کبھی ایک اجنبی چہرہ آپ کی آئندہ زندگی کا مانوس حصہ بن جاتا ہے۔

دبئی میں پرانے دوستوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ پرانے تعلقات کی اپنی آسودگی ہوتی ہے؛ بہت کچھ دوبارہ بتانا نہیں پڑتا، کچھ باتیں پہلے سے مشترک ہوتی ہیں۔ نئی دوستی کی تازگی اور پرانی دوستیوں کی مانوسیت، دونوں اس قیام کا حصہ رہیں۔

ان مہینوں کی ایک بہت اہم خوشی شانزے کے پاس ہونا تھا۔ اس کے ماسٹرز کا آخری مرحلہ تھا۔ اس کے تھیسس کو تکمیل کی طرف بڑھتے دیکھنا اور اس دوران اس کے ساتھ موجود ہونا میرے لیے ماں کی حیثیت سے بہت خاص تجربہ تھا۔ اولاد کی محنت اور زندگی کے اہم مراحل کو قریب سے دیکھنے کی خوشی اپنی جگہ الگ ہوتی ہے۔

شانزے کے ساتھ میری رفاقت کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے میں بہت پسند کرتی ہوں: ہم گھنٹوں باتیں کر سکتی ہیں۔ ایک موضوع سے دوسرا نکلتا ہے، پھر تیسرا، اور وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اس کے بہت سے نظریات سے میرے اختلافات ہیں، بعض باتوں پر خاصے گہرے اختلافات بھی ہیں، لیکن ہماری گفتگو جاری رہتی ہے۔

یہ میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے۔ مجھے ایسی رفاقت پسند ہے جس میں سوال اٹھائے جا سکیں، خیالات پر بات ہو، اپنی بات کہی جائے اور دوسرے کا نقطۂ نظر سنا جائے۔ شانزے کے ساتھ مجھے یہ موقع خوب ملتا ہے۔ ہمارے درمیان اختلاف بھی ہے اور گفتگو کا لطف بھی۔ ان مہینوں میں بیٹی کی رفاقت کے اس پہلو سے میں نے بہت خوشی حاصل کی۔

دبئی کے بعد لندن پہنچی اور اپنی دوسری بیٹی نیہا کے پاس تقریباً تین ہفتے رہی۔ شانزے بہت باتیں کرتی ہے، جبکہ نیہا خاموش طبیعت ہے۔ اس کی محبت کے اظہار کا اپنا انداز ہے۔ اس نے میری بہت دیکھ بھال کی، اور اس کی چھوٹی چھوٹی توجہات کو محسوس کرنا میرے لیے بہت خوش گوار تھا۔

ہر رشتے کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ شانزے کے ساتھ طویل گفتگو میں جو قربت محسوس ہوتی تھی، نیہا کے ہاں وہ اس کے خیال رکھنے کے انداز میں ملتی تھی۔ ان تین ہفتوں میں اس کی محبت کی اس خاموش زبان سے خوب لطف اٹھایا۔

لندن کے قیام کی ایک اور بڑی خوشی ایمن اور اس کے خاندان کے ساتھ وقت گزارنا تھا۔ ایمن میرے لیے میری چوتھی بیٹی کی طرح ہے۔ اس کے تینوں بیٹوں، شاہان، زاران اور روحان، کی محبت مجھے ایک نئی توانائی دیتی ہے۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں اور ان کے ساتھ وقت گزار کر دل خوش ہو جاتا ہے۔

ایمن کے شوہر وقاص بہت پیارے، نفیس، سمجھ دار اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ یہ پورا گھرانہ میرے لیے بہت عزیز ہے۔ ان کے ساتھ گزارے ہوئے وقت میں اپنائیت تھی، بچوں کی محبت تھی اور مل بیٹھنے کی خوشی تھی۔ لندن کی یادوں میں یہ گھرانہ میرے لیے ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ اور پھر، تقریباً چھ ماہ کے بعد، پچھلے ہفتے بریڈفورڈ واپس آ گئی۔

گھر واپسی ہوئی، لیکن اس مرتبہ گھر بھی نیا تھا۔ میری غیر موجودگی میں آفتاب نے گھر بدل لیا تھا۔ پہنچی تو بہت سی چیزیں ترتیب طلب تھیں۔ سامان جمانے، چیزوں کی جگہ بنانے اور گھر کو سلیقے سے ترتیب دینے میں پورا ہفتہ گزر گیا۔

یہاں آکر مجھے محسوس ہوا کہ سفر کے دوران جو کچھ اپنے اندر سمیٹا تھا، اب اسے روزمرہ زندگی میں برتنے کا وقت ہے۔ اپنے ساتھ رہنے کی مشق، خود کو سمجھنے کا موقع اور اس سارے عرصے میں حاصل ہونے والی توانائی گھر کے معاملات سنبھالنے میں میرے کام آرہی تھی۔ میں چیزوں کو ترتیب دے رہی تھی اور اپنے اندر پیدا ہونے والی تبدیلی کو بھی محسوس کررہی تھی۔

اس سفر کو یاد کرتی ہوں تو سب سے پہلے وہ پرواز ذہن میں آتی ہے جو اپنی منزل تک پہنچنے سے پہلے واپس لوٹ گئی تھی۔ اس وقت وہ ایک الجھن تھی۔ آج وہ میری کہانی کا وہ موڑ ہے جس کے بعد حرم کی حاضری، مدینے کی بیماری میں اللہ کی قربت کا احساس، دبئی میں اپنی رفاقت کی دریافت، بیٹیوں کی محبت کے مختلف رنگ اور دوستیوں کی خوشی ایک سلسلے میں جڑتے دکھائی دیتے ہیں۔

میں اللہ کی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ان تجربات سے گزرنے، ان سے سیکھنے اور خود کو بہتر طور پر سمجھنے کا موقع دیا۔ کچھ لمحوں میں جسم کمزور تھا، کچھ میں حالات غیر یقینی تھے، اور بہت سے لمحے محبت اور خوشی سے بھرے ہوئے تھے۔ ان سب نے مل کر میرے اندر کچھ ایسا اضافہ کیا ہے جسے میں اپنے ساتھ واپس لے آئی ہوں۔

گھر کی چیزیں ترتیب دیتے ہوئے بھی مدینے میں محسوس ہونے والا وہ یقین میرے ساتھ ہے۔ میں اکیلی ہو سکتی ہوں، مگر تنہا نہیں۔



کہانی



عائشہ کلیم

ایک خاموش فریاد

ایک بے رحم سماجی رویہ کی نشان دہی کرتی فکر انگیز کہانی

شکیل صاحب شہر کی معروف کاروباری شخصیت تھے۔ دولت، عزت اور سماجی مرتبے، کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ شہر کے پوش علاقے میں ان کا وسیع و عریض گھر تھا جس میں ان کے بوڑھے والدین، بیوی اور دو بچے رہتے تھے۔ گھر میں ملازمین کی بھی کمی نہ تھی۔ زندگی کی ہر آسائش جیسے ان کے دروازے پر دست بستہ کھڑی تھی۔

ان کی بیٹی اریبہ نے حال ہی میں ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کی تھی۔ شکیل صاحب کو یہ پسند نہ تھا کہ ان کی بیٹی کسی ہسپتال میں ملازمت کرے، اس لیے انہوں نے اس کے لیے ایک خوب صورت نجی کلینک بنوا دیا تھا۔ بیٹا اریبہ سے چھوٹا تھا اور برطانیہ کے ایک معروف کالج میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

اب شکیل صاحب اور خصوصاً ان کی بیگم کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اریبہ کی شادی کسی ایسے خاندان میں ہو جو دولت اور مرتبے میں ان کے برابر ہو۔ جلد ہی ان کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی۔

رشتہ ایک خوش حال گھرانے سے آیا۔ لڑکا ڈاکٹر تھا، امریکہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے واپس آیا تھا اور شہر میں اپنا ہسپتال چلا رہا تھا۔ شکیل صاحب اور ان کی بیگم کو اور کیا چاہیے تھا؟ رشتہ طے ہوا اور شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے شکیل صاحب کا گھر، گھر نہیں رہا، کسی میلے میں تبدیل ہو گیا ہو۔

شام ہوتے ہی پورا مکان روشنیوں میں نہا جاتا۔ پھولوں، قمقموں اور رنگ برنگی آرائش سے ہر گوشہ جگمگاتا۔

چھ دن کی تقریبات طے تھیں۔ مایوں، ڈھولکی، دو مہندیاں، شادی اور پھر ولیمہ۔ ہر تقریب کے لیے الگ لباس، الگ زیور اور الگ سجاوٹ تھی۔ اریبہ کی سہیلیاں روز آتیں۔ کبھی گانے بجتے، کبھی قہقہے بلند ہوتے اور کبھی کئی کئی گھنٹے یہ فیصلہ کرنے میں گزر جاتے کہ کس تقریب میں کون سا لباس پہنا جائے گا۔

ایک دن اریبہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔

"یہ والا زیادہ اچھا ہے یا سرخ والا؟" اس نے اپنا دوپٹہ کندھے پر پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"سرخ والا مہندی پر بالکل نہیں۔ وہ شادی والے دن رکھو۔" ایک سہیلی نے فوراً جواب دیا۔

دوسری نے ہنستے ہوئے کہا، "اور یہ ہار تو تمہیں پہننا ہی پڑے گا۔ آخر سب کو پتا بھی تو چلے کہ دلہن کون ہے"

کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ دروازے کے پاس ایک لڑکی خاموشی سے چائے کی ٹرے لیے کھڑی تھی۔ اس کا نام ہاجرہ تھا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے سامنے لگے بڑے سے آئینے میں خود کو دیکھا۔ آئینے میں اریبہ اور اس کی سہیلیوں کے درمیان اس کا عکس بھی دکھائی دے رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان کے جسموں پر ہزاروں اور لاکھوں کے لباس تھے اور ہاجرہ نے وہی سادہ سا جوڑا پہن رکھا تھا جو بیگم صاحبہ نے اسے شادی کے دنوں میں کام کرنے کے لیے دیا تھا۔

"ہاجرہ! ٹرے یہاں رکھو اور ذرا نیچے جا کر امی سے پوچھو اور کچھ تو نہیں چاہیے۔"

اریبہ کی آواز سے وہ چونکی۔

"جی باجی۔"

اس نے فوراً نظریں جھکا لیں۔

ہاجرہ کی ماں پروین کئی برس سے شکیل صاحب کے گھر ملازمہ تھی۔ اس کا شوہر بہت پہلے فوت ہو چکا تھا۔ اس نے گھروں میں کام کر کے اپنی اکلوتی بیٹی کو پالا تھا۔ غربت کے باوجود اس کی خواہش تھی کہ ہاجرہ پڑھے، مگر حالات نے اسے زیادہ آگے نہ بڑھنے دیا۔

شادی قریب آئی تو بیگم صاحبہ نے پروین سے کہا تھا:

"دیکھو پروین، ان دنوں کام بہت ہو گا۔ ہاجرہ کو بھی ساتھ لے آیا کرو۔ مہمان بہت ہوں گے۔ اکیلی تم سے نہیں سنبھلے گا۔"

”جی بیگم صاحبہ۔“

پروین نے سر جھکا دیا تھا۔

یوں ہاجرہ بھی روز اپنی ماں کے ساتھ آنے لگی۔ شروع کے دنوں میں اسے یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔ رنگ، روشنیاں، پھول، خوشبوئیں، خوب صورت لباس اور ہر طرف ہنستی ہوئی لڑکیاں۔ وہ کام کرتے ہوئے چپکے چپکے سب کچھ دیکھتی رہتی۔

مگر آہستہ آہستہ یہی چیزیں اسے اچھی لگنے کے بجائے چبھنے لگیں۔ وہ بھی تقریباً اریبہ ہی کی عمر کی تھی۔ اس کے دل میں بھی خواہشیں تھیں۔ اس نے بھی کبھی سوچا تھا کہ ایک دن اس کے ہاتھوں پر مہندی لگے گی۔ اس کے لیے بھی کوئی خوب صورت لباس آئے گا۔ اس کی ماں بھی اس کے سر پر دوپٹہ رکھ کر اسے دیکھے گی اور اس کی آنکھیں خوشی سے بھر جائیں گی۔ مگر یہاں تو ایک ایک لباس کی قیمت شاید اتنی تھی جتنی اس کی ماں پورے سال میں کماتی تھی۔



ایک شام ہاجرہ نے ایک لڑکی کو کہتے سنا:

”یہ جوڑا صرف ڈیڑھ لاکھ کا ہے۔ مجھے تو اتنا خاص بھی نہیں لگا۔“

”صرف ڈیڑھ لاکھ!“

ہاجرہ کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رک گئے۔ اسے یاد آیا، چند روز پہلے اس کی ماں نے دو ہزار روپے کی دوا خریدنے سے پہلے کتنی دیر سوچا تھا۔ اسی رات گھر واپس جاتے ہوئے ہاجرہ غیر معمولی طور پر خاموش تھی۔

''کیا ہوا بیٹی؟'' پروین نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''طبیعت خراب ہے؟''

''نہیں امی۔''

کچھ دیر بعد ہاجرہ نے اچانک پوچھا:

''امی، غریب لوگ شادی کیسے کرتے ہیں؟''

پروین نے بیٹی کی طرف دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی۔

''جیسے سب کرتے ہیں۔ اللہ سب کے لیے راستہ بناتا ہے۔''

''لیکن امی... میری شادی بھی ایسی ہو گی؟''

پروین کے قدم ایک لمحے کے لیے رک گئے۔

''ہم اپنی حیثیت کے مطابق کریں گے بیٹی۔ خوشی پیسوں سے تھوڑی ہوتی ہے۔''

ہاجرہ خاموش ہو گئی۔ پروین نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''تم فکر نہ کرو۔ اللہ ہمارے دن بھی بدلے گا۔''

لیکن شاید ہاجرہ اب یہ جملہ سننے کی عمر سے آگے نکل چکی تھی۔ اگلے دن پھر وہی روشنیاں تھیں۔ وہی قہقہے۔ وہی زیورات۔

وہی لباس۔ اور انہی کے درمیان ہاجرہ تھی، جو دوسروں کے کمروں سے استعمال شدہ کپ اٹھاتی، پلیٹیں صاف کرتی، بستروں پر بکھرے ہوئے مہنگے لباس سمیٹتی اور آئینے کے سامنے کھڑی لڑکیوں کو دیکھتی رہتی۔

اب اس نے آئینے میں خود کو دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ پروین نے محسوس کیا کہ بیٹی بدل رہی ہے۔ وہ کھانا کم کھاتی، بات کم کرتی اور اکثر رات کو جاگتی رہتی۔

''بیٹی، کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں امی۔''

”مجھ سے بھی نہیں کہو گی؟“

ہاجرہ نے ماں کو دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں جیسے بہت کچھ تھا، مگر زبان پر پھر وہی دو لفظ آئے:

”کچھ نہیں۔“

شادی کا دن آ گیا۔ شکیل صاحب کا گھر دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ قیمتی گاڑیاں ایک کے بعد ایک دروازے پر آ کر رک رہی تھیں۔ خوشبوؤں، روشنیوں، موسیقی اور قہقہوں کے درمیان اریبہ سرخ عروسی لباس میں بیٹھی تھی۔

ہاجرہ نے دور سے اسے دیکھا۔ اریبہ واقعی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ کچھ دیر تک ہاجرہ اسے دیکھتی رہی، پھر خاموشی سے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ رات گئے اریبہ رخصت ہو گئی۔

شکیل صاحب اور ان کی بیگم تھکے ہوئے مگر مطمئن تھے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو اپنی شان کے مطابق رخصت کیا تھا۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ روشنیاں ابھی جل رہی تھیں، مگر موسیقی بند ہو چکی تھی۔ پروین نے برتن سمیٹے، کچن صاف کیا اور بیگم صاحبہ سے اجازت لے کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

اس نے دروازہ کھولا۔

”ہاجرہ؟“

کوئی جواب نہ آیا۔

”ہاجرہ بیٹی!“

چند لمحوں بعد اس کی چیخ نے رات کے سناٹے کو چیر دیا۔ وہی گھر جو چند گھنٹے پہلے شادی کے گیتوں اور قہقہوں سے گونج رہا تھا، اب ایک ماں کی چیخوں سے گونج رہا تھا۔ ہاجرہ مر چکی تھی۔ اس نے اپنی زندگی ختم کر لی تھی۔

پولیس آئی۔ سوال ہوئے۔ تفتیش ہوئی۔ کاغذات بھرے گئے۔ ایک افسر نے آخر کار کہا:

”بظاہر خودکشی کا معاملہ ہے۔ کسی دوسرے شخص کے ملوث ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔“

پروین ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو چکے تھے۔ اس نے آہستہ سے سر اٹھایا۔

”نہیں صاحب۔“

افسر نے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا؟''

''میری بیٹی نے خودکشی نہیں کی۔''

''تو پھر اسے کس نے مارا ہے؟''

پروین کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر اس نے سامنے شکیل صاحب کے گھر کی طرف دیکھا۔ ابھی تک ہزاروں قمقمے جل رہے تھے۔ دروازے پر پھولوں کی محراب قائم تھی۔ لان میں خالی کرسیاں پڑی تھیں۔ کہیں کہیں ادھ کھائے کھانوں سے بھری پلیٹیں میزوں پر رکھی تھیں۔

پروین نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

"مجھے قاتل کا نام نہیں معلوم، صاحب۔ شاید غربت نے مارا ہے... شاید ہماری خواہشوں نے... شاید دوسروں کی دولت کی وہ نمائش جسے ہم روز اپنی آنکھوں کے سامنے سجاتے ہیں۔"

افسر خاموش رہا۔ پروین کی نظریں اپنی بیٹی کے بے جان چہرے پر جم گئیں۔

''میری بچی کئی دن سے چیخ رہی تھی، صاحب۔''

اس نے ہاجرہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''بس... اس کی آواز کسی کو سنائی نہیں دی۔''

باہر شادی کی روشنیاں اب بھی جل رہی تھیں۔

مگر اسی روشنی کے نیچے ایک ایسی تاریکی تھی جسے دیکھنے کے لیے آنکھوں سے زیادہ دل کی ضرورت تھی۔

ہاجرہ کی فریاد واقعی خاموش تھی۔

شاید اسی لیے کسی نے نہیں سنی۔



معاشرت



ثوبیہ نورین

سوشل میڈیا اور سکرین ایڈکشن کے فائدے، میری زندگی کے ضامن!

کیا ہوا، چونک گئے! جی جی، میں سچ کہتی ہوں کہ اب یہی سچ ہے۔ سوشل میڈیا اب ہماری رگوں میں خون کی طرح جاری وساری ہے، ہماری آکسیجن ہے، ہماری زندگی ہے۔

زمانۂ طالب علمی میں میں نے شفیق الرحمن کے افسانے پڑھے تھے۔ سمندری سفروں کے اتار چڑھاؤ، بوریت کے قصے تھے، بڑی رومانوی و دلکشی داستانیں تھیں۔ ایک افسانے "سراب" میں مرکزی کردار اپنے وجود اور اسفار سے بیزار، اپنے ماضی کی یاد میں چور، کسی مے خانے کی بھیڑ میں داخل ہوتا ہے۔ دوست کے کئی بار اصرار پر وہ عرق کا گھونٹ بھرتا ہے اور اس کے ارد گرد کا ماحول جگمگانے لگتا ہے۔ قمقمے، روشنیاں، اس کے اندر کی تنہائی کو مہکانے لگتی ہیں۔ ایک شمع محفل کے سنگ وہ مدہوش ہونے لگتا ہے۔ اور اس کا اپنا تخیلی حسن مادام کے چہرے پہ منتقل ہو گیا۔ مصنوعی و نقلی چہرے اسے اپنی محبوبہ کی حسین یادوں میں دھکیل دیتے ہیں۔

(مے کا اثر زائل ہونے پر اس کے حواس واپس آنے لگے اور پھر دفعتاً اسے نظر آیا کہ مادام کے چہرے پہ جھریاں ہیں جنھیں رنگ وروغن سے چھپایا گیا ہے۔ ارد گرد بے ترتیب لوگ، بے ہنگم پن۔ اس کے قریب نقلی، اوور شوخ چہرے اس کی محبوبہ کی حسین یاد کو ایک بھونڈی، بے ڈھب رفیقہ کی صورت بدلنے لگے۔ (اس نے لاشعوری طور پر سمجھ لیا تھا کہ یہ وہ سچائی ہے جس کا سامنا اس کے بس کی بات نہیں۔) اس نے جلدی سے عرق

کے چند گھونٹ اور بھرے اور مادام کی جھریاں غائب ہو گئیں۔ نظارہ پھر بدلنے لگا۔ فضا میں پھر رنگ بکھرنے لگے۔ منظر پھر سے پر کشش ہو گیا اور وہ اپنی حسین محبوبہ کے سنگ پر کیف نظارے میں کھونے لگا۔



یہی منظر مجھے آج بار بار اپنے گرد نظر آتا ہے۔ بار بار۔۔۔

جس پہر کوئی دانا و ہوشمند انسان کسی غلط فہمی کی طرف توجہ دلا دے، تو انسان کی زندگی میں وہ تذکیر حاصل کرنے کا وقت ہوتا ہے۔ جب پہ در پہ حالات جھنجھوڑیں تو قدرت کے ڈراؤنے پہلو کو سمجھنے کا وقت آجاتا ہے۔ تدبیر کرنے کے اوقات آجاتے ہیں۔ قلبِ منیب رکھنے والوں کو تنبیہ یا نصیحت سن کر سوچنا پڑتا ہے اور زندگی و حالات کو بدلنے کی سعیِ مسلسل سے گزرنا ہوتا ہے۔

مگر آج کے دور میں بڑے سے بڑے عالم کی نصیحت کو بھی یہ شرف آسانی سے نہیں مل پاتا کہ کوئی رک کر، ٹھہر کر، اس کی نصیحت پر تدبر کر لے۔

ہر کسی پر مصروفیات کا وہ بھوت سوار ہے کہ جس میں تفکر اور تدبر کا وقت نہیں۔ ہمیں گھنٹوں ٹک ٹاک، شارٹس اور ریلز دیکھنا اور ٹاک شوز اور لیکچرز سننا منظور ہے، مگر جہاں باری آئے سوچنے کی، تنہائی میں، خاموشی میں غور و فکر کرنے کی، تو ہمارا دم نکلنے لگتا ہے۔ ہمارے حواس اور جسم پر بے چینی اور ڈپریشن کسی کھجلی کی وبا کی

طرح پھیلنے لگتا ہے۔

ہماری حالت اس مچھلی کی طرح ہونے لگتی ہے جسے پانی سے نکال لیا ہو کسی نے، اور پھر کچھ ہی لمحوں بعد ہم پھر سے ایک پر کشش، مسحور کن سوشل میڈیا کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتے ہیں۔

جہاں ہر درد کی دوا ہے، ہر وبا کا علاج اور ہر کرب سے نجات۔

آپ حیران ہوں گے کہ وہ کیسے! تو میں بتاتی ہوں۔

بس آپ ذرا پانچ منٹ کو عقلی و ذہنی طور پر میرے ساتھ رہیے گا۔ کوئی سوال آئے تو رک کر خود کو جواب ضرور دیجیے گا۔

تو بتائیے، کیا ایسا نہیں کہ آپ زندگی کی پہیلیوں سے پریشان رہتے ہیں؟

کائنات کی وسعتوں کے جو راز کھلے ہیں، سیاروں کی گردش اور سورج و چاند کے انتہائی پیچیدہ و حساس تناسب سے گردشِ ایام جو محوِ حیرت کرتی ہے، برق رفتاری سے سفر کرنے والی کہکشاؤں اور سیاروں کے بیچ آپ کی کرۂ ارض کا رنگین اور شاد و آباد ہونا، زمین و آسمان میں لاتعداد مخلوقات کا جو تحفہ سجا ہے، سمندروں کی گہرائیوں میں جو پراسراریت پنہاں ہے، ایک بے جان سے چھوٹے سے بیج سے پھلوں اور ذائقوں کی جو بہار پھوٹتی ہے۔۔۔ کیا یہ آپ کے دل سے یہ صدا جاری نہیں کراتا کہ یہ سب عبث نہیں؟

آپ اپنے اندر ہی اندر ایک ہلکی سی آواز نہیں سنتے کیا؟

الا الحق!

وہ صدا آپ کو جھنجھوڑتی ہے، کچھ یاد دلاتی ہے کہ آخر میں اتنا خاص کیوں ہوں؟ آپ کے اندر کئی سوال اٹھاتی ہے:

میں آخر کیوں نوازا گیا؟ مجھے آخر کیا کرنا ہے، یہ سب عظیم نعمتیں پا کر؟

کیوں مجھ پر شہابِ ثاقب نہیں برس رہے؟

کیوں خطرناک حیوانات اپنی ایک حد میں ہیں؟

کیوں سمندر کبھی کبھار ہی اپنی حد سے آگے ٹھاٹھیں مارتا ہے؟ سب تہس نہس نہیں کر دیتا ہے؟

اس کا یہ بے قابو ہونا تھمتا کیسے ہے؟
کیوں ہر وقت میں زلزلوں کی زد میں نہیں؟
امن اور زندگی کا یہ امکان آخر قائم کیسے ہے؟
اور شاید یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کو رکنا چاہیے۔

شاید سوال کا مقصد یہ نہیں کہ فوراً کوئی ایسا جواب مل جائے جو ہماری بے چینی ختم کر دے۔ شاید کچھ سوال ہمیں اپنے اندر مزید گہرائی میں اترنے کے لیے ملتے ہیں۔ مگر ہم کیا کرتے ہیں؟ ہم سوال کے ساتھ بیٹھنے کے بجائے فوراً اس سے بچنے کا راستہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔

جب ذاتی دکھ اور اندر کی بے چینی ہمیں گھیرتی ہے

انسان صرف کائنات کے سوالات سے نہیں گھبراتا۔ کبھی اپنے ہی اندر کے سوالات اسے تھکا دیتے ہیں۔

انسانوں کی اونچ نیچ، درجوں کی برتری و کمتری کی شورش، ناگہانی آفات کا ہزاروں جانوں کو نگل جانا، زلزلے کے ایک جھٹکے کا کچھ سیکنڈوں میں علاقوں کو کھنڈر بنا کے رکھ دینا، دشت و صحرا میں انسانوں اور جانوروں پر جاری ظلم و ستم جب ذہن کو تھکاتا ہے، ذہنی تناؤ جکڑنے لگتا ہے اور شعور کسی رحیم کی رحمت پر سوال اٹھاتا ہے، کسی الحکیم ہستی کی حکمت بے انصافی لگنے لگتی ہے، تو اس وقت ہمارے ذہن اور سوچوں کے طلاطم کو پر سکون کون کرتا ہے؟

اور جب ہمارا ایمان ڈگمگانے لگتا ہے تو یہی موبائلز، ہمارے محسن بن کر بروقت ہمارے پاس، اور ہم ان کے پاس آن پہنچتے ہیں۔

بس پھر نہ کوئی الجھن الجھن رہتی ہے، نہ کسی حکیم کی حکمت پر سوال۔ سنگین بھی ہوں تو محو ہونے لگتے ہیں۔

اور ایمان سلامت رہ جاتا ہے، بلکہ پکا، جامد رہ جاتا ہے۔

لیکن کیا واقعی سوال حل ہوا؟

یا صرف ہماری توجہ کہیں اور منتقل ہو گئی؟

اگر ہم ہر بے چینی کے وقت اپنے ذہن کو فوراً کسی نئی تصویر، ویڈیو، خبر یا آواز سے بھر دیں، تو ہمیں یہ موقع کب ملے گا کہ ہم اپنی بے چینی کو سمجھ سکیں؟ اور اگر ہم اسے سمجھ ہی نہ سکیں تو اسے بدلنے کا عمل کہاں سے شروع ہو گا؟

جب معاشرے کی سیاہ سچائیاں ہمیں بے چین کرتی ہیں

جب ملکوں کے مابین جنگیں، بین الاقوامی اور ملکی و سیاسی کشیدگیاں ہمارے شعور اور ادراک کو جلا کر خاکستر کر رہی ہوتی ہیں، روز روز دو سال، چار سال، سات سال، تیرہ سالہ بچیوں کے ساتھ ہر اسمنٹ اور ریپ کی خبریں کانوں میں گرم سیسے کی طرح پڑتی ہیں، بیویوں کے ساتھ بد سلوکی، پڑھی لکھی عہدے دار و با اثر عورتوں کے ساتھ بھی بروٹل وائلنس اور بے دردی سے قتل جیسی خوفناک سچائیاں سمجھ نہیں آتیں اور دکھ روح کا حصار کرنے لگتا ہے، تو معاشرے کی ان سیاہ سچائیوں کو بدلنے کے لیے سرپٹ گھوڑے دوڑانے کی صعوبت میں مبتلا ہونے کے بجائے ہمارے پاس ایک آسان راستہ موجود ہے۔

بڑی بڑی ٹی وی سکرینز اور چھوٹی چھوٹی موبائل سکرینز کا ایک بٹن دبانا ہمارے اندر بھڑکتی آگ پر پانی ڈالنے کا کام کرتا ہے۔

ہم رنگوں کی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔ ہمارے چہروں پر مصنوعیت و مصنوعات کی دنیا وہ مسکراہٹیں بکھیرتی ہے کہ تپش کا نام و نشان نہیں رہتا۔

طاقتور کی طاقت کا نشہ کمزوروں پر جس بجلی کی طرح گرتا ہے، جس سے ہمارا دل دہل جاتا ہے، ملک کے رکھوالے و خادم جب اپنی رعایا اور عوام کو نوچ کے کھا جاتے ہیں، گھروں میں دھمکیاں، دھرنوں کی سیاست، جبری بھرتیاں اور برخاستگیاں، گھروں میں گھس کے غنڈہ گردی اور توڑ پھوڑ، چند فیکٹریوں کے مفاد کو بچانے کی خاطر کئی لوگوں کے کاروبار و معاش کو کچلنا، قانون کے اٹھتے جنازے جب ہمارے اندر کے نظامِ عدل کو للکارتے ہیں کہ آخر یہ سب بربریت کیوں!

اور ہم کچھ کر گزرنے، علم و شعور کو جگانے، محرکات پر غور و فکر کرنے کی صعوبت اٹھانے کا عزم باندھنے کی سوچ کر خود کو ہلکان کر رہے ہوتے ہیں۔

جب ہمت ٹوٹ اور جڑ رہی ہوتی ہے، انسان کی روح چھلنی اور جسم گھائل ہو رہا ہوتا ہے، تو تب آخر وہ کون ہے جو ہمیں اس درد اور تکلیف کے گزرنے کی زحمت سے بچاتا ہے؟

یہی سوشل میڈیا کی لت، یہی سکرین ایڈکشن، جو ہر تکلیف دہ سوچ کو دوسرا رخ دے کر ہمیں کچھ کر گزرنے کی مشکل سے بچاتی ہے۔

یہاں شاید ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے: کیا کسی تکلیف دہ حقیقت سے چند لمحوں کے لیے دور ہونا اور بات ہے، اور ہر بار اس حقیقت سے فرار اختیار کرنا اور بات؟ کیا ہماری سکرین ہمیں آرام دے رہی ہے، یا ہمیں اس آرام کا عادی بنا رہی ہے؟

جب ہم اپنی ہی زندگی میں اپنے ضمیر سے بھاگتے ہیں

اپنے ہی ملک میں آزاد ہونے کے باوجود طاقت والوں، عہدے والوں کے غلام بن کے رہ جاتے ہیں۔ اپنے ووٹوں کی حفاظت نہیں کر پاتے، اپنے نمائندوں کو الیکشن سے پہلے سپردِ خاک کرتے ہیں۔

دل میں اٹھنے والا درد رات کو سونے نہیں دیتا۔

دن بھر اپنے باس کی جی حضوری کرتے وقت جب کسی ایماندار کی چغلی کرتے ہیں، باس کی چاپلوسی کر کے جب مراعات حاصل کرتے ہیں، جب آفس میں موجود دوسرے کولیگز کو دھوکہ دے کر اپنی عزت اور رعب بڑھاتے ہیں، تو تب جو ضمیر کی چبھن تنگ کرتی ہے، آخر اس چبھن سے کون نجات دلاتا ہے؟

کون توجہ بٹاتا ہے؟

یہی سوشل میڈیا کی رعنائیاں اور رونقیں۔

اور شاید یہی اس کا سب سے خاموش فائدہ ہے: یہ ہمیں اپنے آپ سے بچا لیتا ہے۔ اپنے ضمیر کے سوال سے، اپنے فیصلوں کے حساب سے، اپنی ذمہ داری سے۔

جب روزمرہ زندگی کا بوجھ ہمیں خود سے دور کر دیتا ہے

جب دن بھر قصے سنتے ہیں اپنے جوانوں کے روزگار کے مواقع کی عدم دستیابی کے، کالجوں میں نوجوانوں کے آئس اور دیگر نشوں کی لت کے، سکولوں میں جاری کاروباری دوڑ اور ہسپتالوں میں علاج اور صحت کے نام پر ہونے والی پیچیدگیوں کے، تو محرومی اور اضطراب کو روز ہوا ملتی ہے۔

آپ اپنے گھر و عیال کے خرچے پورے کرتے کرتے مانے کی اس دلدل میں پھنس چکے ہیں جو آپ کو خود سے ملنے سے بھی روکتی ہے۔

ہر چھوٹی بڑی شے پر دوگنے تگنے ٹیکسوں کی ادائیگی اس وقت آپ کا خون کھولا دیتی ہے جب آپ ٹوٹی سڑکوں پر سفر کر کے گھر پہنچتے ہیں۔ بارش کے بعد سڑکوں کے اطراف میں نشیب اور کھڈوں میں بھرا پانی آپ کے کپڑوں ہی کو نہیں، دل کو بھی بھگو دیتا ہے۔

مَردوں کی سرد مہری اور خواتین کی دہائیاں، سکولوں کی غلام گردشوں میں بھٹکتے معصوم بچے، نوکریوں اور بے شمار روزگار کمانے اور تعیشات کے کلچر میں برتری پانے کی دوڑ میں گم والدین کی توجہ اور ان کی فزیکل اٹیچمنٹ و قرب سے محروم بچے، اور کاموں میں رُجھی، عزت و پیار و وقار اور ذاتی شناخت سے محروم عورتیں، جب بچوں کو زبردست گدھوں کی مانند ٹنوں کتابوں کا منوں کام کرواتی ہیں اور ان کے نمبروں کے مقابلے کر کے اپنے بچوں کی انفرادیت کا گلا گھونٹ کر، جب رات کو بستر پر اداسی اور بے کلی کے ساتھ کمر لگاتی ہیں، اور کمروں میں اندھیرے کے باوجود ذہن نیند کی وادی میں گھس نہیں پاتا، جب سماج کی سیاہی دماغ کے اندر گھلنے لگتی ہے اور کروٹیں بدل بدل کر وجود تھک رہا ہوتا ہے اور نیند کی گولیوں کی خواہش ابھرتی ہے، تو آخر کون سی شے ہمارا سہارا بنتی ہے؟

آنکھوں کے سامنے وہ کون سی ہلکی سی روشنی ہے جو ہر اندھیرے، بے چینی اور سوچوں کو سلا دیتی ہے اور ہم کھو سے جاتے ہیں؟

بالکل!

شفیق الرحمن کے افسانوں میں لکھے ہیرو کی مانند، جو ارد گرد کی بے ڈھب حقیقتوں کو دیکھنے کی تاب نہیں لا پاتا، تو مے کا ایک گھونٹ اور بھر لیتا ہے۔۔۔

اور منظر پھر بدل جاتا ہے۔

شاید اصل سوال یہ نہیں کہ سکرین ہمیں کیا دیتی ہے۔ اصل سوال شاید یہ ہے کہ وہ ہم سے کیا لے رہی ہے؟

کیا وہ صرف ہمارا وقت لے رہی ہے؟

یا ہماری خاموشی؟ ہماری توجہ؟ ہماری برداشت؟ یا شائید ہماری سوچ کے ساتھ بیٹھنے کی صلاحیت؟

وہ آہستہ آہستہ ہمیں اس مقام تک لے جا رہی ہے جہاں حقیقت کا سامنا کرنے سے پہلے ہی ہماری انگلی اسکرین پر اگلی ویڈیو ڈھونڈ لیتی ہے؟

حل کی طرف:

اور اگر ایسا ہے تو پھر شاید ہمیں سکرین سے جنگ شروع کرنے سے پہلے اپنے آپ سے ایک چھوٹا سا تجربہ شروع کرنا چاہیے۔

کسی ایک بے چینی کے وقت فوراً فون اٹھانے کے بجائے چند منٹ رک کر دیکھیں۔

میں اس وقت کیا محسوس کر رہا ہوں؟

میں کس سوال سے بچ رہا ہوں؟

میں کس حقیقت کو دیکھنا نہیں چاہتا؟

اور اگر میں اس سوال سے بھاگنے کے بجائے کچھ دیر اس کے ساتھ بیٹھ جاؤں تو کیا ہو گا؟

شاید کوئی فوری جواب نہ ملے۔

شاید بے چینی بھی ختم نہ ہو۔

مگر شاید پہلی بار ہم اپنی زندگی کے کسی سوال کو سکرول کر کے آگے نہیں بڑھائیں گے۔

اور شاید یہی وہ چھوٹا سا مقام ہے جہاں سکرین کے استعمال اور سکرین سے فرار کے درمیان فرق پیدا ہونا شروع ہوتا ہے۔

کیونکہ زندگی کے ہر مسئلے کا حل فوراً حاصل کرنا ضروری نہیں۔ بعض اوقات ضروری صرف اتنا ہوتا ہے کہ ہم مسئلے کو دیکھ سکیں، اس کے ساتھ کچھ دیر ٹھہر سکیں، سوال پوچھ سکیں، اپنے مفروضوں کو جانچ سکیں اور پھر کوئی چھوٹا سا قدم اٹھا سکیں۔

ورنہ ہماری انگلی اگلی ریل پر چلی جائے گی۔

اور منظر پھر بدل جائے گا۔

ہم پھر سے مسکرائیں گے۔

اور زندگی کا وہ سوال، جو جواب مانگ رہا تھا، وہیں کہیں پیچھے رہ جائے گا۔





جاوید احمد غامدی

غزل

روشنی کی جستجو ہوتی ہے جب ظلمات میں
دیکھ لیتے ہیں کلام اللہ کے آیات میں

زندگانی کیا ہے؟ پیہم جلوہ ہاے ناتمام
جس طرح جگنو چمکتے ہیں اندھیری رات میں

کس کا یارا ہے یہ ارباب تصوف کے سوا
اپنی صورت دیکھ سکتے ہیں خدا کی ذات میں

آسماں سے آپ سیکھے ہیں یا وہ بھی آپ سے
عمر بھر کا روٹھ جانا اک ذرا سی بات میں

جب بھی آیا ہے کہیں دنیا میں کوئی انقلاب
بڑھ گئی ہے اور کچھ تلخی جو تھی اوقات میں

کس نے سوچا تھا یہ آب و خاک کا عالم تمام
پہلے ذروں میں بدل جائے گا، پھر آنات میں!

قصۂ ماضی ہوا سب بزم آرائی کا شوق
ہم بھی کیا کھوئے گئے ہیں نو بہ نو آلات میں

فیض صاحب، آپ نے چاہا تھا، لیکن کیا کہیں
خون کے دھبے نہیں دھلتے کسی برسات میں





فرحان سید (ڈیلس ٹیکسس)

غزل

پتھر بھی دسترس میں ہے، شیشہ بھی دستیاب
بکھرے نہ جس کا عکس وہ چہرہ بھی دستیاب

موجود ہے ہمارے یہاں ہر قسم کا زخم
گہرا بھی دستیاب ہے تازہ بھی دستیاب

جتنا تمہارا ظرف ہے مل جاؤں گا تمہیں
دریا بھی میرا روپ ہے قطرہ بھی دستیاب

میں بھی تھکن سے چُور تھا، لمبے سفر کے بعد
اسکے سرائے دل میں تھا کمرہ بھی دستیاب

ہم کو بھی شوق تھا کہ چنیں راستہ کٹھن
اور تھا مخالفت کو زمانہ بھی دستیاب

ساکن ہوا جو علم کے اس شہر میں اسے
ہو گا نہ اک سکون کا لمحہ بھی دستیاب

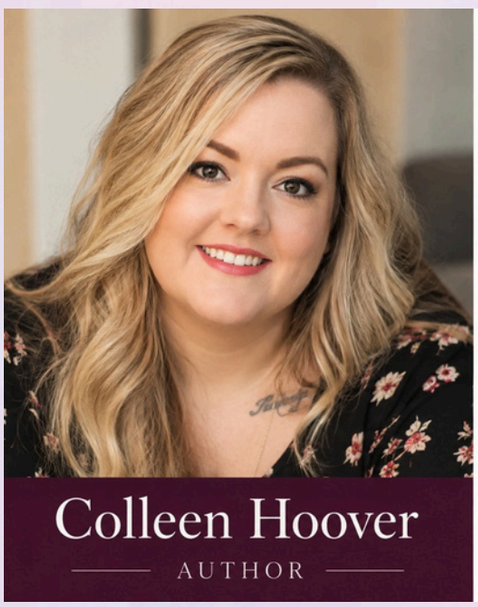
سید مزید کتنی سہولت تجھے ملے
کوہِ گراں ہے سامنے تیشہ بھی دستیاب

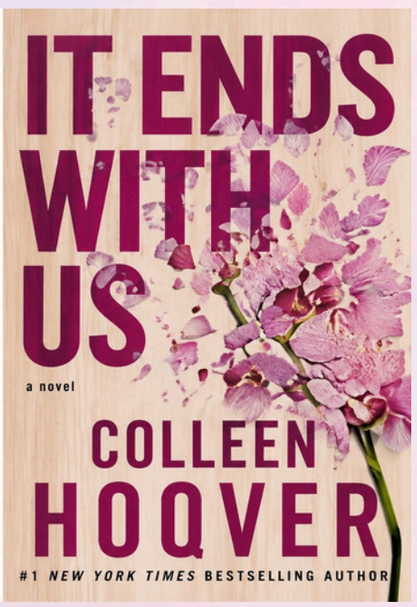


تعاف کتاب

مجلس صالحات

محبت، تشدد اور ایک عورت کا فیصلہ
It Ends with Us





مصنفہ: کولین ہوور (Colleen Hoover)

زبان: انگریزی

ضخامت: صفحات (پہلا امریکی ایڈیشن) 376

پہلا ایڈیشن: نیویارک، 2 اگست 2016ء Atria Books

قیمت: پہلے امریکی پیپر بیک ایڈیشن کی درج قیمت 16 امریکی ڈالر
صنف: Contemporary Romance / Women's Fiction

بعض کتابیں اپنی اشاعت کے وقت مقبول ہوتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ قارئین کی یادداشت سے محو ہو جاتی ہیں۔ بعض کتابوں کے ساتھ معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ وہ خاموشی سے آتی ہیں، کچھ عرصہ اپنے قارئین پیدا کرتی رہتی ہیں اور پھر اچانک کسی نئے سماجی یا ثقافتی ماحول میں غیر معمولی زندگی حاصل کر لیتی ہیں۔ امریکی خاتون ناول نگار کولین ہوور کا ناول It Ends with Us اسی دوسری قسم کی کتاب ہے۔

یہ ناول 2016ء میں شائع ہوا، مگر اس کی حیرت انگیز مقبولیت کئی برس بعد سامنے آئی۔ سوشل میڈیا، بالخصوص نوجوان قارئین کی آن لائن کتابی دنیا نے اسے دوبارہ دریافت کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ لاکھوں قارئین تک پہنچ گیا۔ اس کامیابی کا ایک سبب یقیناً اس کی سادہ، رواں اور جذباتی کہانی ہے، لیکن اس کے پیچھے ایک زیادہ اہم حقیقت بھی ہے۔ کولین ہوور نے محبت کی کہانی کے پردے میں ایک ایسا سوال اٹھایا ہے جس کا سامنا دنیا کے تقریباً ہر معاشرے کی بے شمار عورتوں کو کرنا پڑتا ہے:

> اگر آپ اس شخص سے محبت کرتے ہوں جو آپ سے محبت کا دعویٰ بھی کرتا ہو، لیکن وہی شخص آپ کو اذیت بھی پہنچاتا ہو تو محبت کہاں ختم ہوتی ہے اور اپنی عزت اور سلامتی کا حق کہاں سے شروع ہوتا ہے؟

ایک بظاہر خوب صورت محبت

ناول کی مرکزی کردار للی بلوم ایک نوجوان عورت ہے۔ اس کا بچپن خوش گوار نہیں گزرا۔ اس نے اپنے گھر میں باپ کو ماں کے ساتھ بدسلوکی کرتے دیکھا ہے۔ بچے اپنے والدین کی زندگی کو محض دیکھتے نہیں، اسے اپنے اندر جذب بھی کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ للی کے ماضی کا یہ تجربہ اس کی آئندہ زندگی میں ایک خاموش پس منظر کی طرح موجود رہتا ہے۔

وہ ماضی سے نکل کر اپنی دنیا خود بنانا چاہتی ہے۔ تعلیم حاصل کرتی ہے، بوسٹن منتقل ہوتی ہے اور پھولوں کا اپنا کاروبار شروع کرتی ہے۔ یہیں اس کی ملاقات رائل کنکیڈ سے ہوتی ہے۔ رائل ایک کامیاب نیورو سرجن ہے۔ ذہین، تعلیم یافتہ، پُرکشش اور بظاہر ایسا شخص جس کے ساتھ ایک خوب صورت مستقبل کا خواب دیکھا جاسکتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچتے ہیں۔

یہیں کولین ہوور قاری کے ساتھ ایک اہم نفسیاتی کھیل شروع کرتی ہے۔ وہ رائل کو ابتدا ہی سے کسی روایتی ولن کی صورت میں پیش نہیں کرتی۔ اگر وہ پہلے صفحے سے ظالم، بدکردار اور قابلِ نفرت آدمی ہوتا تو للی کے سامنے کوئی اخلاقی مسئلہ ہی پیدا نہ ہوتا۔ وہ اسے چھوڑ دیتی اور کہانی ختم ہو جاتی۔ اصل کہانی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ رائل میں محبت کرنے کے قابل خوبیاں بھی موجود ہیں۔

لیکن رفتہ رفتہ اس محبت کے اندر غصہ، حسد، ملکیت کا احساس اور پھر تشدد داخل ہونے لگتا ہے۔ اور للی ایک خوف ناک حقیقت کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے؛ جس زندگی سے بچنے کے لیے اس نے اپنے بچپن میں جدوجہد کی تھی، کہیں وہی زندگی ایک نئے نام اور نئے چہرے کے ساتھ اس کے سامنے تو نہیں آگئی؟

Atlas — ماضی کا ایک دروازہ

کہانی میں ایک تیسرا اہم کردار اٹلس کوریگن ہے، جو للی کی نوجوانی کی پہلی محبت تھا۔ برسوں بعد وہ دوبارہ اس کی زندگی میں آتا ہے۔

بظاہر یہاں ایک مانوس رومانوی مثلث بن سکتی تھی: ایک عورت اور دو مرد۔ مگر ناول کی اصل اہمیت اس سوال میں نہیں کہ للی رائل کو منتخب کرے گی یا اٹلس کو۔ اصل سوال اس سے کہیں گہرا ہے؛ للی خود کو منتخب کرے گی یا نہیں؟

یہ فرق اس ناول کو عام رومانوی کہانی سے کچھ آگے لے جاتا ہے۔ اٹلس ایک متبادل مرد ہی نہیں بلکہ للی کے ماضی، اس کی نوجوانی، اس کی یادوں اور اس امکان کی علامت بھی بن جاتا ہے کہ زندگی کا موجودہ دکھ ہی زندگی کی آخری حقیقت نہیں۔

تشدد صرف ایک تھپڑ نہیں

ناول کا سب سے طاقت ور پہلو گھریلو تشدد کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ باہر کھڑے شخص کے لیے یہ کہنا

بہت آسان ہے:

”اگر شوہر مارتا ہے تو عورت اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتی؟“

لیکن حقیقت اتنی سادہ نہیں ہوتی۔ تشدد کرنے والا شخص چوبیس گھنٹے تشدد نہیں کرتا۔ وہ محبت بھی کر سکتا ہے، معافی بھی مانگ سکتا ہے، رو بھی سکتا ہے، اپنے عمل پر شرمندہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ وعدہ بھی کر سکتا ہے کہ دوبارہ ایسا نہیں ہو گا۔ متاثرہ عورت کے پاس بھی اس شخص کے ساتھ صرف خوف کی یادیں نہیں ہوتیں؛ محبت، قربت، امید اور مشترکہ خواب بھی ہوتے ہیں۔

یہی وہ پیچیدگی ہے جسے کولین ہوور نے کہانی کا مرکز بنایا ہے۔ قاری کو رفتہ رفتہ احساس ہوتا ہے کہ مظلوم عورت سے یہ پوچھنا کہ ”تم چلی کیوں نہیں گئیں؟“ شاید درست سوال نہیں۔ زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ ایک محبت کرنے والا انسان اس مقام تک کیوں پہنچتا ہے کہ دوسرے انسان کے لیے اس سے محبت کرنا خطرناک ہو جاتا ہے؟



ماں کو نئے سرے سے سمجھنا

ناول کا ایک اور خوب صورت نفسیاتی پہلو للی اور اس کی ماں کے تعلق میں سامنے آتا ہے۔ بچپن میں بچے بعض اوقات اپنی مظلوم ماں سے بھی ناراض ہوتے ہیں۔ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ اگر باپ ظلم کرتا ہے تو ماں اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتی؟ لیکن جب للی خود اسی طرح کی جذباتی پیچیدگی میں داخل ہوتی ہے تو وہ اپنی ماں کے ماضی کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے لگتی ہے۔ یہاں ناول ایک اہم انسانی حقیقت تک پہنچتا ہے:

دوسرے انسان کے فیصلے کو باہر کھڑے ہو کر سمجھنا آسان ہے؛ اسی شخص کے مقام پر کھڑے ہو کر فیصلہ کرنا کہیں زیادہ مشکل۔

یہ محض تخیل نہیں۔ اس موضوع کی شدت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کے پیچھے مصنفہ کی ذاتی زندگی کا سایہ موجود ہے۔ کولین ہوور نے کتاب کے اختتامی نوٹ میں بتایا کہ اس کے والدین کے تعلق اور بالخصوص اس کی والدہ کے تجربے نے اس کہانی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی لیے بعض مقامات پر ناول کسی سماجی مسئلے پر لکھی ہوئی کہانی سے بڑھ کر ایک ذاتی گواہی محسوس ہونے لگتا ہے۔ مصنفہ تشدد کرنے والے مرد کو صرف ایک عفریت میں تبدیل نہیں کرتی۔ یہ فیصلہ فنی اعتبار سے اہم ہے، کیونکہ حقیقی زندگی میں مسئلہ اکثر اسی وجہ سے پیچیدہ ہوتا ہے۔ اگر برائی ہمیشہ ایک بدصورت چہرے کے ساتھ سامنے آئے تو انسان کے لیے اسے پہچاننا بہت آسان ہو جائے۔ زندگی میں بعض اوقات وہ خوب صورت چہروں، محبت بھرے جملوں اور اچھے ارادوں کے ساتھ بھی آتی ہے۔

ادبی معیار کی بلند ترین کسوٹی پر دیکھا جائے تو It Ends with Us کو دوستوفسکی، ٹالسٹائی یا ورجینیا وولف کی روایت کا نفسیاتی ناول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی زبان نسبتاً سادہ ہے، کرداروں کی تشکیل میں بھی بعض جگہ مقبول عام فکشن کی سہولتیں دکھائی دیتی ہیں اور اتفاقات کا استعمال بھی موجود ہے۔

لیکن مقبول فکشن کو صرف کلاسیکی ادب کی کسوٹی پر جانچنا بھی مناسب نہیں۔ کولین ہوور کی اصل مہارت قاری کی دل چسپی برقرار رکھنا ہے۔ وہ قاری کو فلسفہ نہیں پڑھاتی؛ اسے ایک صورت حال کے اندر کھڑا کر دیتی ہے۔ اب فیصلہ قاری کو کرنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صفحات تیزی سے پلٹتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے انکشافات، ماضی کی یادیں، تعلقات کی تبدیلیاں اور جذباتی کشمکش مسلسل کہانی کو آگے بڑھاتی ہیں۔ مصنفہ ہر چند صفحات بعد قاری کے سامنے کوئی ایسا جذباتی سوال رکھ دیتی ہے جس کا جواب جانے بغیر کتاب بند کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ تکنیک نئے فکشن نگاروں کے لیے خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہے۔

ناول کی کمزوریاں

غیر معمولی مقبولیت کسی کتاب کو تنقید سے بالاتر نہیں کر دیتی۔ ناول کے بعض حصوں میں جذباتیت ضرورت

سے زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ بعض کردار اتنے موزوں وقت پر کہانی میں داخل ہوتے ہیں کہ حقیقت کے بجائے مصنفہ کی ضرورت محسوس ہونے لگتے ہیں۔ رومانوی عناصر بعض مقامات پر گھریلو تشدد جیسے نہایت سنگین مسئلے پر غالب بھی آجاتے ہیں۔

یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ گھریلو تشدد جیسے موضوع کو محبت کے لبادے میں پیش کرنا مسئلے کی سنگینی کو کم کر سکتا ہے۔ اس اعتراض میں وزن موجود ہے۔ لیکن اسی کا دوسرا رخ بھی ہے۔ شاید یہی رومانوی قالب وہ دروازہ تھا جس سے لاکھوں نوجوان قارئین ایک ایسے مسئلے کے اندر داخل ہوئے جس پر وہ کسی سماجیاتی یا نفسیاتی کتاب کے سینکڑوں صفحات کبھی نہ پڑھتے۔

یہ مقبول ادب کی ایک پرانی طاقت ہے: وہ بعض اوقات وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں علمی کتاب نہیں پہنچ سکتی۔

عورت، محبت اور عزتِ نفس

ہمارے معاشروں میں عورت کو رشتہ نبھانے، گھر بچانے، برداشت کرنے، درگزر کرنے اور قربانی دینے کی تعلیم بہت دی جاتی ہے۔ یہ سب اپنی جگہ بڑی انسانی قدریں ہیں۔ کوئی معاشرہ صبر، وفاداری اور معافی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ لیکن ایک سوال پھر بھی باقی رہتا ہے:

صبر کی آخری حد کیا ہے؟

کیا ہر برداشت فضیلت ہے؟

کیا ہر معافی اصلاح پیدا کرتی ہے؟

کیا خاندان بچانے کی ذمہ داری صرف اس شخص پر عائد ہوتی ہے جس پر ظلم ہو رہا ہو؟

اور کیا کبھی ایسا مقام بھی آتا ہے جہاں رشتہ بچانے سے زیادہ ضروری انسان کو بچانا ہو جاتا ہے؟

کولین ہوور ان سوالات کا کوئی فلسفیانہ مقالہ نہیں لکھتی۔ وہ ایک عورت کی زندگی ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے اور قاری کو اس کے ساتھ چلنے دیتی ہے۔ یہی فکشن کی طاقت ہے۔

عنوان کا مفہوم

It Ends with Us — "یہ سلسلہ ہم پر ختم ہو گا" — محض ایک رومانوی عنوان نہیں رہتا۔

اس میں ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہونے والے تشدد کا تصور پوشیدہ ہے۔ ایک بچی اپنے گھر میں

جو کچھ دیکھتی ہے، وہ انجانے میں اس کی اپنی آئندہ زندگی کا حصہ بن سکتا ہے۔ یوں ظلم صرف دو افراد کے درمیان واقع ہونے والا ایک واقعہ نہیں رہتا؛ وہ نسلوں میں منتقل ہونے والا رویہ بن سکتا ہے۔ اس زنجیر کو کسی ایک مقام پر کسی ایک انسان کو توڑنا پڑتا ہے۔ اور شاید ناول کا سب سے مضبوط اخلاقی پیغام یہی ہے:

> ہم اپنے ماضی کے ذمہ دار نہیں، لیکن یہ فیصلہ ضرور کر سکتے ہیں کہ اپنے ماضی میں ملنے والے زخم اگلی نسل تک پہنچائیں گے یا ان کا سفر اپنے اوپر ختم کر دیں گے۔

